Journal of law social and management sciences 2(1) 1-24, 2024
Journal home page: https://jlsms.org/index.php/jlsms

Open Access
ISSN:2959-3867

The Politics of Civilization, cultural and ideological Clash: In The light of Huntington and Fukuyama Point of View

تہذیب، ثقافت اور فکری تصادم کی سیاست: ہنٹنگٹن اور فوکویاما کے افکار کے تناظر میں۔

Muhammad Ali Junaid *[1]

*[1] Ph.D. Scholars, Department of Political Science, University of Karachi
*[1] majunaid@live.com

Abstract: This article is focused on terrorism, chaos and panic prevailing worldwide somehow due to a clash of ideologies. We will first explore the concepts of the End of History and the clash of civilizations and will also discuss the basics of cultural clashes, conflicts and structural differences. This passage will further put light on the term politics of **C2** (POC2) means politics of civilizational and cultural clashes. Rather than defining different schools of thought opposing each other ideologically in different paradigms and contradicting points of view that force others to accept them without any argument. Even though these theories have been criticized and have come under attack, contain many flaws and errors and have been objected and rejected academically. But in the world of conflicting ideologies and propagandas, they are used to exploit emotions. These concepts also brainwash innocent youth, these practices should be considered as human intellect, not as weapons and teaching tools for persuading people to kill and loot humanity based on certain philosophies. Our major focus is that clashes do not happen among civilizations but it may be found among cultures and ideologies, these are mostly so opposing and contradictory to each other that they do not allow an average man to loathe and discriminate against others on such ground. States and governments should not believe in theories like the End of History and the Clash of Civilizations and neither should consider the clash among ideologies as major and final theory. Clash among civilizations may be a fact but this is only one side of reality, many remaining faces and dimensions are still uncovered and yet unexplored.

Key Words: Clash of Civilization, Clash of Ideologies, Clash of Perceptions, Islam, West, Ideas, Idealism, Science, realism, religion, Islam, West, Huntington, Fukuyama, Modernity, Postmodernity, East, Individualism, capitalism, Democracy, Liberalism, Atheism, politics.

تمہید:

کوئی بھی پڑھ لکھا کتاب خور انسان عصر حاضر میں موجود علمی، فکری پیچیدگیوں کو لے کر حیران و پریشان ہو سکتا ہے، اسے مختلیف نظریات اور افکار کے مابین فکری تفریق اور تصادم پر ذہنی پریشانی بھی لاحق ہو سکتی ہے وہ اضطرابِ فکر کا شکار بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ محققین کی ظاہری دماغی حالت دیکھ کر عام فرد یہی سوچتا ہے کہ جناب زیادہ پڑھ لکھ کر سٹھیا گئے ہیں، ایک غالب شکوک بھری علمیت یہ بیانیہ قایم کرتی نظر آتی ہے کہ دنیا بھر میں بہت سے سیاسی اور نظریاتی عقیدے اور تصورات ۱۹۹۰ کے بعد کا یہ کلپ ہونا شروع ہوئے تھے جب سویت یونین کا سقوط ہوا تھا، دیوارِ جرمنی منہدم ہوئی تھی، اور خلیج فارس کی بدنام زمانہ جنگ مشرق وسطی پر مسلط کی گئی تھی۔ جس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورتحال نے نیو ورلڈ آرڈر کے جواب میں عالمی دہشت گردی کی ایک ایسی لھر پیدا کی تھی جو نو دو گیارہ کے سانحہ کے بعد شتر بے مہار ہو گئی تھی۔ مغربی مستشرقین کو محسوس ہوا کہ نیو ورلڈ آرڈر اور سرمایہ دارانہ، جمہوری ثقافت و تمدن کو جواب دعوی دینے کی سکت اگر کسی تہذیب و تمدن میں موجود ہے تو اسے اسلامی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ بقیہ تہذیب و تمدن نے اپنے ذاتی تشخص اور وجود پر اصرار کے بر خلاف مغربی تہذیب و تمدن کو پوری طرح اپنا لیا تھا اور صرف اپنی ذاتی تہذیب و ثقافت کو اس عالمی تہذیب کے ذیل کر کے مغربی تہذیب کے ساتھ پل تعمیر کر دئے تھے، اگر ہم ٹوائن بی آرنلڈ سے، ہنگٹنگٹن اور فوکویاما تک فکری مشاہتوں، اخذ و تلمیذ کی تخریب کرنے بیٹھیں تو معلوم ہو گا کہ، دوسری عالمی جنگ کے بعد اپنے وجود برقرار رکھنے اور خود کی ملی تعمیر کے لئے یورپ نے مسلم ممالک کو آزادی تو دے دی تھی، مگر ترقی کے مختلیف معیارات قایم کر کے، بلواسطہ اسلامی دنیا کو اپنا غلام بنانے کی کوشش وہ عرصہ دراز سے کرتا چلا آرہا تھا، جنگ عظیم دویم نے کشمیر و فلسطین کے جو غیر مختتم مسایل برطانیہ کے ذریعہ پیدا کئے تھے اس نے مسلم ملت کے کل مستقبل کو عرصہ سے جنگ کے دھانہ پر بٹھا

رکھا ہے۔

مسلم دنیا اس وقت ایک ایسی فکری یلغار کے غلبہ میں نظر آرہی ہے جس سے نکلنا قدامت پسند اور غیر قدامت پسند مسلم دنیا کے لئے بہت مشکل ہو گیا ہے، اگر فوکویاما کی بات کو سنجیدگی سے لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اسے تاریخ کے اختتام نامی کتاب میں یہ یقین کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی، کہ اشتراکی روسی اتحاد کے ٹوٹنے کے بعد مغربی، سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اس کی کوکھ سے پیدا ہونے والا انسانی حقوق کا فلسفہ کل عالم انسانی کے لئے آخری سیاسی و معاشی مذاہب ثابت ہو چکے ہیں۔ اور اب اس نظام کے ساتھ کل عالم کو تا ابد حیات بسر کرنا ناگزیر محسوس ہونے لگا ہے، جبھی اب جو اس تہذیب و تمدن کی آدرشوں سے منہ موڑے گا وہ انسان کی مغربی نشاۃ ثانیہ کی تعریف پر پورا نہیں اترتا ہے لہذا اس نیم وحشی انسان کے چولے میں حیوان کا قتل عام کرنا جایز امر ہے، اگر بادی النظر میں ہم امریکہ اور یورپ کی دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا مطالعہ و مشاہدہ کریں، اس کی جزیات و کلیات کو خورد بینی نگاہ سے دیکھیں، عراق، افغانستان اور لیبیا کے سقوط دیکھیں، کشمیر و فلسطین میں ہونے والی نسل کشی دیکھیں تو بات تسلیم کرنا کوئی مشکل کام محسوس نہیں ہو گا، کہ جس نتیجہ کا ہم اشارہ کیا وہ اسی مغربی تصورِ انسان کی تعریف کے سبب ہے۔

ہنٹنگٹن کا اعتقاد کم از کم سویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد یہی بن چکا ہے کہ اس عالم میں صرف اور صرف ایک ہی سپر پاور اور اس کے اتحادیوں کا غلبہ قایم ہو چکا ہے اور جس کا رہنما امریکہ ہے موصوف کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں کوئی دوسری تہذیب ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے، کسی میں ان سے آگے نکلنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے۔ اور یہ نئی دنیا ہمیشہ یونی قطبی رہے گی[i] اس قسم کی فکر کے علمی جواز کے لئے بہت سے نظریات و افکار تاریخ و سیاست میں نمودار ہوئے ہیں، مگر ان نظریات و سیاسی عقاید میں جو دو افراد سب پر سبقت لے گئے اور خود کے بعد کی دنیا کو انھونے فکری یرغمال بنالیا وہ دونوں نظریات مغربی تہذیب و تمدن کے سرخیل امریکہ کے سیاسی پیامبروں کے قلم سے پھوٹے تھے، مابعد یہی نظریات سیاسی علماء اور مورخین کے لیے اپنی تہذیبوں اور ثقافتوں کی بالادستی کو ثابت کرنے کے لیے ایک ذریعہ بن گئے۔ اور اس کل یورپی اور امریکی تہذیب کو مجموعی طور پر مغربی تہذیب کا نام دیا گیا ہے جس میں مغربی انفرادی طور پر آبائی ثقافتوں کو شامل حال تسلیم کیا گیا ہے۔

ان دونوں سیاسی مذاہب اور عقاید کو مندرجہ ذیل ناموں سے یاد کیا جاتا ہے:

ا۔ تاریخ کا خاتمہ۔[ii]

۲۔ تہذیبوں کا تصادم۔[iii]

غور طلب بات یہ ہے کہ ہیں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہنٹنگٹن اور فرانسس فوکویاما دونوں امریکہ میں مقیم سیاسی سایینسدان رہے ہیں، دونوں کسی نا کسی سطح پر امریکی حکومت سے وابستہ پائے گئے ہیں، فوکویاما اور ہنٹنگٹن دونوں نے اول ان تصورات کو اپنے مقالات میں پیش کیا تھا مابعد انہیں وسعت دے کر کتاب میں تبدیل کر دیا گیا، اول الذکر کی کتاب ۱۹۹۲ میں سامنے آئی جبکہ موخر الذکر جو ۲۰۰۸ میں ارتحال فرما چکے ہیں کی تصنیف ۱۹۹۳ میں نمودار ہوئی، دونوں ہی ایک دوسرے کے موقف کو گھما پھرا کر الگ الگ دایرہ کار میں پیش کرتے نظر آتے ہیں اور نتیجہ دونوں کا یہی ہے کہ مغربی تہذیب اپنے معراج کو پہنچ چکی ہے اور ارتقائی تاریخی تسلسل نے سرمایہ دارانہ جمہوریت کو دنیا کا دایمی و ابدی مذہب بنا دیا ہے، ثقافتوں کے مابین اختلافات مسلسل ہوتے رہتے ہیں، صدیوں کے ان تاریخی تصادم نے بلاخر مغرب کو فتح دلائی ہے، اور اب ایک ہی تہذیب و تمدن اس تہذیب کو دعوت مقابلہ دے سکتی ہے اور وہ اسلامی تہذیب ہے، چونکہ یہ تہذیب تلمذ و مفاہمت میں مغرب کے ساتھ نہیں چل پا رہی ہے جبھی اب ان دونوں فکروں کا تصادم ناگزیر ہے، واضح رہے کہ فوکویاما نے سیاست و معیشت میں رجحان ساز تبدیلی دیکھ کر، روس، چین، بھارت، جاپان، کوریا، اور دیگر ضمنی قوتوں کا عروج دیکھ کر اپنے قول سے کافی حد تک پسپائی اختیار کر لی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں کتب جن دعووں پر استوار ہیں یہ کتب ان کو علمی و فکری طور پر ثابت نہیں کر سکی ہیں۔ جدید مابعد الطبیعات اور پس جدیدیت کے عروج نے تمام عالمی افکار،، مہا بیانیوں اور بلخصوص سایینسی مذہب اور عقیدے کو جو دعوت مقابلہ دیا ہے، عقل کی خدائی کو جس طرح تہہ و بالا کیا ہے، مصنف کے موقف کی جگہ قاری اور سامع کے موقف اور خواہش کو جس طرح اہم جانا ہے، لذت، اشتہا، اور خودی جس طرح پیمانہ حق و باطل بن گئے ہیں، ویب کلچر اور سوشل میڈیا نے جس طرح عام آدمی تک رسائی حاصل کی ہے وہاں انسانی معبودیت نے سارے اصولوں کے پرخچے اڑا دئے ہیں۔ جس سے محسوس ہونے لگا ہے کہ تصادموں کی نوعیت فکری و مالی نوعیت کی حامل ہو گئی ہے اور تصادم در حقیقت تہذیبوں کے مابین وقوع پذیر نہیں ہو رہے ہیں بلکہ بہت حد تک ثقافتوں کے مابین نمودار ہو رہے ہیں، چونکہ تہذیبوں میں ملاپ اور اخذ کی قوت ہوتی ہے جبھی یہ طبیعتاً وسیع المشرب ہوتی ہیں اور ثقافتوں میں لسانی، دیہی، قبایلی، علاقائی، رسمی و رواجی امور کارفرما ہوتے ہیں جبھی یہاں مزاحمت، جمود، انفرادیت پر اصرار تصادموں کا سبب بنتے ہیں، ریاست تہذیب کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، ریاست شہروں اور صوبوں کا اتحاد ہوتی ہے جبھی یہ نیم وفاق سے لیکر بین الاقوامی انجمن تک سے الحاق و اتحاد کر لیتی ہے، عالمی گاوں کا حصہ بن جاتی ہے، مگر ثقافتی تصادم سوشل میڈیا سے میدان جنگ تک تصادم اور جنگوں کا سبب بنتے ہیں۔ اس تحقیق میں ہم مختلیف متنوع پہلو سے ان تصادم کو محور بحث بنانے کی کوشش کریں گے۔

کوئی بھی سایل مسلہ ہذا میں کافی اشکالات وارد کرنے کی حالت میں ہوتا ہے، سوال پوچھ کر ان پر اعتراض کر سکتا ہے، وہ فکر و نظر کے مابین اختلاف، جوہری تفریق اور نظریاتی پیچیدگیوں کو لے کر علمی دنیا کے صحراوں کی خانہ بدوشی میں خلجان و ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے، ہر علم و فکر کی کوئی نا کوئی اساس ہوتی ہے، اس کی روح و جوہریت ایک خاص دایرہ علمی میں تیرتی پھرتی ہے، ہر علم کی خاص اصطلاحیں ہوتی ہیں جن سے گزرے بغیر معاملہ فہمی دقیق اور مشکل ہوتی جاتی ہے، ان اصطلاحات کی صحیح نوعیت اور تعریف کے بارے میں اختلاف سمجھے بغیر علمی میدان میں شہسواری کرنا ایک مشکل کام سمجھا جاتا ہے، جس میں منہ کے بل گرنے کے امکانات بھی وسیع ہوتے ہیں، دوسری طرف کم

علمیت اور بنا مطالعہ و تحقیق زیادہ مواد سے اخذ و تبلیغ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے، اور یہ غلط فہمیاں کسی غیر محقق عالم فاضل کو جستجو سے دور اور آسانی سے قریب لا کر علمی معیار کو گہنا دیتی ہیں۔ جیسا کہ کتاب کی جگہ عام صفحہ اول کی گوگلنگ علمی سقم پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

میں یہ امر قبول کرتا ہوں کہ میں نے اول ان سیاسی سائنسدانوں کی دونوں کتابوں کا اردو ترجمہ زیر مطالعہ رکھا تھا بعد ازاں میں نے ان مقالات کو انگریزی میں دیکھا جو ان کتب کے وجود میں آنے کا سبب بنے تھے، جہاں ان تحقیقی مضامین میں وسعت کی کمی تھی تو وہیں کتب میں بے ربط دلایل اور فکری مواد پیچیدگی کا سبب بنتے نظر آتے ہیں، جہاں تک ہنٹنگٹن کا تعلق ہے ان کی کتاب فکری کم اور حالات حاضرہ کے واقعات و سانحات سے زیادہ دلایل زیادہ قایم کرتی نظر آتی ہے، اس کتاب کی فکری بنیادیں ایک طرف ٹواین بی ارنلڈ سے جڑین ملاتی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف فوکویاما بھی چھلکتا نظر آتا ہے ، اگرچہ اس کا حوالہ اور نام اس میں ظاہری طور پر نظر نہیں آتا ہے۔ دوسری طرف فوکویاما کی فکر پر سیاسی و معاشی نظریات کی چھاپ جابجا نظر آتی ہے، یہ ایک سیاسی و تاریخی فلسفہ کی کتاب محسوس ہوتی ہے، جس پر ہیگل اور اور اس کے شارح کوجے۔ وے کی چھاپ جابجا محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ ہیگلیائی فلسفیانہ رجحانات رکھتا نظر آتا ہے لیکن وہ بذاتِ خود ساتھ ایک حقیقت پسند مفکر نظر آتا ہے، اپنے مفروضے کو مضبوط کرنے کے لیے جابجا فکری اقتباسات پیش کرتا نظر آتا ہے۔ مگر حوالوں کا مفروضے سے کتنا تعلق بنتا ہے یہاں ابہام اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں ، دوسری طرف ہنٹنگٹن زیادہ واضح، موقع پرست ہے، اور اس کی کتاب اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ وہ فلسفے پر کم توجہ دیتا ہے اور اپنا معاملہ سروے، حقائق، شماریات اور کرنٹ افیئرز کی مدد سے سادہ زبان میں پیش کرتا نظر آتا ہے جبھی یہ سادہ تاثر فوکویاما کے فلسفیانہ تاثر کے مقابل زیادہ مقبول عام ٹھہرا ہے۔

جیسا کہ ایڈورڈ گائیڈری اور نیوٹن ہاورڈ نے بھی کتاب پڑھتے ہوئے اس بات کو نوٹ کیا اور انھونے اشارہ دیا ہے کہ ہنٹنگٹن کا مضمون اس کی کتاب کے مقابلے میں زیادہ واضح، حسابی اور جامع نظر آتا ہے۔[iv]

فوکویاما کے نظریات اور اس کے نتایج و عواقب:

اگر فوکویاما کی جڑوں کی جستجو کی جائے تو معلوم ہوگا کہ فوکویاما دو مشہور فرانسیسی فلسفیوں: ژاک ڈیریڈا اور رونالڈ بارتھس کا شاگرد بتایا جاتا ہے، اور یہ دو فلسفی مابعد الجدیدیت کے فکری دبستان میں حوالہ کا درجہ رکھتے معلوم پڑتے ہیں، مگر یہ چھاپ براہ راہ امریکی سیاسی حلقوں تک رسائی ہونے کے سبب اس میں مابعد الطبیعاتی جراثیم پیدا نہیں کر سکی ہے، غالبا اس دوران وہ پیرس میں موجود تھے، جب فوکو وہاں تھا دوسری طرف ہاورڈ یونیورسٹی میں جہاں سے انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی وہاں وہ ۱۹۷۳ سے ہنٹنگٹن اور ہیری مینسفیلڈ سے رابطے میں تھے۔ وہ رینڈ کارپوریشن کے ساتھ بھی کام کرتے رہے ہیں، فوکویاما آبائی طور پر جاپانی ہے، وہ زیادہ فلسفیانہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود مقبولیت کے لحاظ سے ہنٹنگٹن سے امریکہ کے باہر کافی پیچھے ہے۔ ان کی کتاب کا پائریٹڈ ورژن ۲۰۰۵ میں ایشیائی مارکیٹ میں نمودار ہوا، یہ وہ وقت تھا جب ہنٹنگٹن کا اثر ختم ہو رہا تھا. ان کی کتاب: دی اینڈ آف ہسٹری اینڈ لاسٹ مین اسٹینڈ ۱۹۹۲ میں آزاد پریس کے ذریعہ شائع ہوئی اور اس کا پروٹوآرٹیکل ۱۹۸۹ میں شائع ہوا تھا دوسری طرف ہنٹنگٹن کا آرٹیکل ۱۹۹۳ میں خارجہ امور میں شائع ہوا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ فوکویاما ہیگل سے بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے جو اپنے جھکاؤ کی وجہ سے آئیڈیلسٹ یا عینیتی مفکر سمجھا جاتا ہے اگرچہ فوکویاما حقیقت پسند فرد ہے لیکن اپنی تحریروں میں افلاطون، ہیگل، نطشے اور الیگزینڈر کوجیرے جیسے زیادہ تر مثالیت پسندوں کا ذکر کرتا نظر آتا ہے، بلخصوص وہ زیادہ تر کوجیرے سے متاثر نظر آتا ہے، جن سے اس نے تاریخ کے خاتمے کا تصور لیا ہے اور خود کوجیرے ہیگل کا شارح ماہر سمجھا جاتا ہے. جو اپنے ماسٹر کام :تاریخ کا مطالعہ" کے لیے مشہور ہے۔

کوجیوے کا کہنا ہے کہ تاریخ کا خاتمہ ہے کیونکہ یکساں (متحدہ) عالمی ریاست تشکیل دی گئی ہے جس کا مطلب لبرل ڈیموکریسی ہے، اور اس ریاست نے یونیورسل لبرٹی اور مساوات کے تصور کے ذریعے آقاؤں اور غلاموں کے درمیان تعلق ختم کر دیا ہے۔ اور پوری تاریخ میں انسان اسی موقع کی خواہش رکھتے تھے، لہٰذا اب اپنی خواہش پوری کرنے کے بعد وہ خوش ہے۔[v]

بتایا جاتا ہے کہ فوکویاما نے اپنے کام میں بیس کتابوں سے حوالہ جات فراہم کیے ہیں اور اس کا ۷۰۰ سے زیادہ کتابوں اور مضامین میں حوالہ دیا گیا ہے یہاں تک کہ ہنٹنگٹن بھی فوکویاما سے کچھ متاثر معلوم پڑتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس کا مرکزی خیال ٹواین بی۔ آرنلڈ اور برناڈ لویس کی فکروں سے اخذ کردہ ہے، مشہور مستشرق برنارڈ لویس کا مضمون[vi] کتابی صورت میں اور دو میں "اسلام کا بحران" کی صورت میں چھپ چکی ہے، جہاں ایک طرف مسلمانوں پر تنقید ہے وہیں ان کی بے چینی پر تشویش کا بھی اظہار ہے، تہذیبوں اور ان میں تصادم پر یہاں بالغ اں نظری سے محقق کو مطلوبہ مواد میسر آجاتا ہے، جہاں تک فوکویاما کا تعلق ہے وہ اپنی کتاب کے تمہید میں وہ اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے:

اس نے قومی مفاد کے جریدے کی گرمائی اشاعت میں جس عنوان سے ۱۹۸۹ میں ایک مضمون لکھا تھا اس کا عنوان تھا: **تاریخ کا خاتمہ؟**، جس میں اس نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا تھا کہ: لبرل جمہوریت بہترین نظام حکومت ہے کیونکہ تمام (نظریاتی) نظام جیسے بادشاہت، فاشزم اور حالیہ سوشلزم جیسے متبادل نظام کامیاب نہیں ہو پائے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ لبرل ڈیموکریسی انسانی نظریاتی ارتقا کا آخری نقطہ (دور) ہے، وہاں کے عمل کے ذریعے انسانی نظام حکومت اپنی آخری اور حتمی شکل میں نمودار ہو چکا ہے، اور یہی تاریخ کا اختتام ہے۔[vii] .

فوکویاما جمہوریت کو سمجھنے میں نظامیاتی پرستش میں اتنا آگے چلا گیا تھا کہ اسے جمہوریت کے منفی رزایل و خصایل بھی نظر نہیں آرہے تھے کیونکہ جمہوریت کسی الوحی اور فطری نظام کا نام نہیں ہے، بلاشبہ اس میں کافی خوبیاں ملتی ہیں مگر بہت زیادہ مادیت، مرکز گریزی، انفرادیت اور سرمایہ دارانہ نوازی بھی ملتی ہے، کہ جس پر سوال کھڑا کرنا مابعد

الطبیعاتی گناہ تصور کیا جاسکے، بلکہ یہ زیادہ سے زیادہ خوش نظری سے کتنا بھی دیکھا جائے ایک حکومتی انتخاب کا شراکت عامہ پر انحصار کرتا نظام ہے جو مختلف لبرل اور مابعد جدید نظریات کو مربوط و یکجا کرتا محسوس ہوتا ہے، بلکہ یہ ایک ارتقائی نظام ہے جس میں اقلیت اکثریت کی نیابت و نمایندگی کے نام پر حکومت کرتی نظر آتی ہے، جس کے نتیجہ میں یہ کہنا ممکن ہو جاتا ہے کہ بادشاہت اور فاشزم کا خاتمہ کر کے سیاسی تمدن و معاشرہ کچھ قدم آگے بڑھ چکا ہے، جس میں سرمایہ رب اور جمہوریت سرمایہ کی آئینی رکھوالی کرنے والی ایک آئینی سہولت کار بن چکی ہے، سرمایہ اور تخلیقات کے جمود سے نمٹنے کے لئے جمہوریت مسلسل تغیر و پیش قدمی پیدا کرنے کے لئے مسلسل ترقی کے معیار بندی قایم کرتی نظر آتی ہے جو نتیجتاً کل سیاسی دنیا کو تقسیم کا شکار کر دیتی ہے جو برہمنی طبقاتی جتھہ بندی کی نئی شکل تصور کی جاسکتی ہے، جیسے پہلی دنیا جو ترقی یافتہ ہے، دوسری دنیا جو ان کی تقلید میں ترقی کے دایرہ کار میں داخل ہو چکی ہے، تیسری دنیا جو تاحال ابھی ترقی کرنے میں مگن ہے اور فکری، معاشی، صنعت و حرفت کے معیار سے ابھی آشنا ہو رہی ہے اور آخری اسفل دنیا جو سب سے کمتر دنیا ہے شودر نما چوتھی دنیا جو تاحال ترقی اور جدیدیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ جو لوگ جمہوریت کے ماسوا دیگر سیاسی نظاموں کو ابلیس کے نظام سمجھتے ہیں بہ نظر غایر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان افراد، ممالک اور اداروں کی کی تربیت اور پرورش مغربی سامراجی، نوآبادیاتی نظام، میں ہوئی ہے اور یہ سب اب پسِ نوآبادیاتی نظام میں داخل ہو چکے ہیں جو ادارہ پرستی کے دور ہے، لیکن ان تیسری دنیا میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی سیاسی جماعتوں کے سربراہان، جاگیردار، سیاسی و غیر سیاسی پیر و فقیر، ایم ایل اے، ایم این اے، ایم پی اے، بیوروکریسی اور ملٹر و کریسی جزئی سطح پر جماعتی شہنشاہیت کا کردار ادا کر رہے ہیں، امریکی مفکر **ایمی چوا** نے جس جدید سیاسی قبایلیت پر بات کی اور جس کا ہم نے مختصر حال اوپر پیش کیا ہے اس کی مبادیات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

ہر ایم پی اے اور ایم این اے اپنی اپنی سلطنت کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے اور یہ لوگ بلدیاتی اداروں کو کام نہیں کرنے دیتے ہیں جیسا کا پاکستان کے ضمن میں جانچا جاسکتا ہے، جس کے بغیر فلاحی مغربی جمہوریت لنگڑی لولی سمجھی جاتی ہے، یہ لوگ مفادات کے حصول کے لئے ایک پارٹی سے دوسری پارٹی بدلتے رہتے ہیں، لوگوں کو خوشحالی، اصول اور وقار کی ضرورت ہوتی ہے جو جمہوریت میں سرمایہ اور مادی ترقی کے تابع ہو جاتے ہیں دوسری طرف آمریت کی طرح قبائلی اقدار اور روایات پر بننے والے چند ایشیائی معاشرے زیادہ تر اس کی طرف مائل ہوتے ہیں، کیونکہ مرکزی شاہی خاندان کی جگہ وہ خود انتخابی حلقہ کے شاہ بن جاتے ہیں۔ آمریت، بادشاہت سے متاثر جمہوریت کا مشرقی رجحان پاکستان کی قبائلی پٹی، افغانستان، مشرق وسطیٰ، وسطی ایشیا اور افریقہ میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مغرب نے اس عالمگیر سچائی کو نظرانداز کر دیا ہے کہ ہر حیاتیاتی انسان کی اپنی الگ الگ حیاتیاتی خصوصیات اور خصائص ہوتے ہیں، ہر علاج کا انداز الگ الگ مریض پر الگ الگ اثر کرتا ہے کم از کم ہومیوپیتھک طریقہ علاج انفراد مزاج کو تشخیص کے ضمن میں زیادہ اہمیت دیتا نظر آتا ہے جبکہ مغرب کل دنیا کے بخار کا علاج ملایم اور حربی طاقت کی پینا ڈول سے کرنے کی حکمت عملی پر عمل پیرا نظر آتا ہے، جراحی اور چیڑ پھاڑ کے علاوہ وہ کوئی اور دوسرا علاج نہیں جانتا ہے۔ لبرل جمہوریت اور اس سے متعلقہ اقدار اس لئے کامیاب محسوس ہوتے ہیں کیونکہ پورا یورپ اور امریکہ ایک ہی نظریاتی بنیاد پر مشترک اقدار کے حامل ہیں، ان کی فکری بنیادیں ماضی میں کیتھولک تھیں، سولہویں صدی میں اس کو پروٹسٹنٹ فرقہ کے تشکیل نے جواب دعوی دیا، یوں نشاۃ ثانیہ کی کوکھ سے مغرب کا سرمایہ کی بڑھوتری منڈیوں اور زمینوں کی تسخیر و دریافت کرنے والا، معقولی ، روشن خیال، اعتدال کا دعوی کرنے والا صنعتی نوعیت کا حامل انسان پیدا ہوا، جو ان کے مطابق ہومیو سیپین نسل سے بڑھتا ہوا یورپ میں موجودہ شکل میں پیدا ہوا ہے، جس نے مذہب کو اجتماعیت سے نکال انفرادی نوعیت کا حامل بنا دیا ہے، جس نے لذت، کام اور مطلب کی افادیت کو قایم کیا ہے، جیسا کہ افادیت پسندوں کا نقطہ نظر ہے، اس انفرادیت پسند نظام نے پدر سری معاشرت کو جواب دعوی دیا، خاندان کو بس ایک انفرادی ضروریاتی مجموعہ نسل قرار دیا، انسان کو ہی حق و باطل کا پیمانہ قرار دیا یوں اس فکر کی انتہا امریکی فیڈرلسٹ پیپرز سے گزر کر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے اعلامیہ ۱۹۴۸ میں عروج ثریا کو چھونے لگی تھی اس طرح ہمارا آج کا بشریت پسند جمہوری سرمایہ دارانہ انسان پیدا ہوا جو جمہوریت کی فوکویاما کی زبان میں انتہا کی علامت ہے، اور یہ انسان اور اس کی جمہوری معاشرت انسانی تمدن کا آخری رخ ہے اور یہ رخ کامل شکل اس وقت تک نہیں اختیار کریگا جبتکہ انسانی جمہوری معاشرت و تمدن مقابلہ کرنے والے آخری انسان کو بھی اپنے جیسا نہیں بنالیتا ہے۔

ان کے مذہبی اختلافات سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اور وہ ایک نظریاتی ارتقاء سے گزرے ہیں، اہل مغرب کو نوآبادیاتی غلاموں کی طرح چند سالوں میں یہ تصورات فوراً نہیں ملے ہیں جن میں یہ اشتراک کرتے ہیں۔ فوکویاما اور اس کے جاپانی آباؤ اجداد نے ۱۹۴۵ کے بعد جب امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی کو وہاں ایٹمی بموں کا تجربہ کر کے تباہ کر دیا تھا امریکہ ہجرت کر لی تھی اور جاپان جو مغربی نظریے کی بالادستی کو قبول کرنے سے پہلے ایشیا میں اک دور تھا کافی الگ تھلگ واقع ہوا تھا، جب کچھ مشنریوں نے وہاں عیسائیت پھیلا کر مغربی افکار کے لئے زمین بنانی شروع کی تھی اس لیے اس کے لیے ایسا دعویٰ کرنا آسان ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ کل جاپان اس رنگ میں رنگ گیا تھا۔ دوسرے ایشیائی ممالک کے لیے ان کے نقطہ نظر کو قبول کرنا آسان ہے، کیونکہ وہاں ایک بدھی غیر مذہبی آزاد خیالی مشرقی مقامی اقدار کے باوجود کسی نا کسی شکل میں موجود تھی۔ نظریات سب سے زیادہ وہیں کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں جہاں عوام ان کو قبول کرنے پر راضی ہوں لیکن وہ زیادہ تر ان جگہوں پر معقولی اور مفید ہونے کے باوجود ناکام رہتے ہیں جہاں انہیں زبردستی دوسروں پر مسلط کیا جاتا ہے۔

اس ضمن میں فوکویاما اور اس کے عصری حامی افراد جدلیاتی مادیت پسند نظریہ کو بھی فراموش کر جاتے ہیں، کیا اس نے کبھی یہ سوچا ہے کیا؟ کہ جمہوریت کی نوعیت آخر فکری طور پر کس قسم کی ہے؟ یہ دعوی ہے، جوابِ دعوی ہے یا پھر کوئی امتزاجی ترکیب

بندی ہے؟ کیا اس ارتقائی سیاسی مذہب نے صدیوں سے نمودار ہونے والے مختلیف مواقف کو جدلیاتی فکری تصادم کے بعد موجودہ ہیت میں تسلیم کر لیا ہے؟ اگر یہ دعوی ہے تو ہمیں جوابِ دعوی کا انتظار کرنا چاہئے اور اگر یہ امتزاجی ترکیب ہے تو ہمیں انتظار کرنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ نظریاتی عمل کا اگلا مرحلہ کیا ہوگا؟ یہ سلسلہ کیا فوکویاما کی سابقہ تحقیق کے مطابق رک چکا ہے یا مارکس اور ہیگل کی فکر کے مطابق مسلسل پیہم اضدادی ٹکراو اور تصادم کا شکار رہے گا؟ دوبارہ دعوی آئے گا، پھر جواب دعوی اور پھر انکا امتزاج یا مابعد از امتزاجی دور نمودار ہوگا؟. فوکویاما شاید درونِ خانہ مغرب سے کہہ رہا ہے کہ وہ اپنی نظریاتی پیروی بند کردے۔ کیونکہ اس کے نظریہ کو قبول کرنے کا مطلب آزادی کا خاتمہ، لبرل ازم کا خاتمہ، ثقافتی تنوع کا خاتمہ، سائنسی پیروی کا خاتمہ، سیکولرازم کا خاتمہ، مذہب کا خاتمہ، خدا کی موت اور جبری تعدیل کے نظریہ کو قبول کرنا وغیرہ ہیں، کیا اس نظریہ کو مان کر مغرب ایمی چوا کے فکری خوف کے مطابق جمود کا شکار ہو سکتا ہے حلانکہ سائنس اور جدید فلسفہ حرکت و تنوع پر ایمان رکھتا ہے۔

کیونکہ فکر کی آخری منزل، قیامت کی گھڑی ہوتی ہے، کیا عظیم تباہی سے قبل کی دنیا اگر جمہوری ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے؟ یوں عقل پرستی کی پوری انسانی جستجو کام کرنا چھوڑ دے گی، اور تقلیدی جمود کا شکار ہو جائیگی، سماجی سائنس علمی طور پر پنپنا بند ہو جائے گی، جمود سائنسدانوں کو ایک اور منفرد راستہ اختیار نہ کرنے پر مجبور کر دے گا، فوکویاما سوویت یونین کی معیشت کی ناکامی کی بنیادی وجہ کو بھی بھول گیا ہے، نوکر شاہی کے اس ضمن میں کردار، ظلم اور جبر کو علت ماننے سے گریزاں ہے، کیوں کہ واحد عنصر اتنا فیصلہ کن نہیں ہوتا ہے جو کسی بھی ریاست جیسی پیچیدہ مربوط کل اور قوم کو ناکام بناتا ہے، بلکہ زوال، سقوط اور ناکامی کے پس پشت بہت سے طریقے، عوامل اور محرکات کردار ادا کرتے ہیں جو انہیں ناکام بنا دیتے ہیں۔

آج کا دور پوسٹ نیو کلونیل ازم کا دور ہے یعنی ایک طرح سے ادارہ پرستی کا دور ہے یہاں تک کہ ریاستوں کو بھی ایک میکرو آرگنائزیشن کے طور پر سمجھا جا رہا ہے جو صوبوں، کارپوریٹ ازم، نیشنل اداروں، ملٹی نیشنل آرگنائزیشنز اور این۔ جی۔ اوز کے درمیان مفاہمتی (کوآرڈینیٹنگ) اتھارٹی کے طور پر کام کرتی نظر آتی ہے، نئی ریاستوں کی تخلیق کے باوجود اختیاری ادارے جاری ہیں اور دولت کو ادارہ جاتی ثقافتوں نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ حقیقت میں ظاہری طور پر بادشاہتیں ختم ہو چکی ہیں مگر یہ اب تجارتی طور سرمایہ دارانہ خاندانوں کی صورت میں منقلب ہو چکی ہیں جو اپنے سرمایہ کو اداروں کے ذریعہ پیدا کر کے مسلسل دولت کی تخلیق کی خاطر کاروبار چلا رہے ہیں جیسے روتھ شیلڈ، راک فیلر، بش، مرڈاک، شریف برادران، ٹاٹا، امبانی وغیرہ۔ لہذا ادارہ جاتی بادشاہت کا عروج ہر جگہ غالب آسکتا ہے پھر وہ زمینی طور پر سیاسی متحرک اور ثقافتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں۔ ہر طرف مسابقت اور تصادم ہر سطح پر جاری و ساری ہے، پارسی نیکی اور بدی کے خداوں کی مانند ہر سطح پر ٹکراو اور تصادم جاری و ساری نظر آتا ہے، سبقت اور برتری کے لئے اتحاد بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں، مقداری اور معیاری نہج کا تصادم فکر کو بھی کاروبار کی طرح متاثر کرتا نظر آتا ہے۔

فکری تصادم کے ضمن میں جاوید چوہدری کا روزنامہ ایکسپریس۔ کراچی میں شائع ہونے والا ایک کالم مجھے یاد آرہا ہے جو آٹھ دس سال قبل میری نگاہ سے گزرا تھا جس میں انہوں نے ایک نقطہ نظر پیش کیا تھا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ دراصل دو استادوں کے مقلدین کی لڑائی ہے، ان کے مطابق اخوان المسلمین اور جہادی سید قطب سے متاثر معلوم پڑتے ہیں اور امریکی باز مشہور مستشرق برنارڈ لویس سے متاثر نظر آتے ہیں یوں دنیا دونوں استادوں کی فکر سے پیدا ہونے والے تصادم کے سبب آج جنگ میں مشغول ہے، اس سے ذرا ہٹ کر اخوان المسلمین، حسن البنا، سید قطب اور امام ابن تیمیہؒ پر گفتگو کیرن آرم اسٹرانگ اپنی کتب یروشلم اور خدا کے لئے جنگ میں کر چکی ہیں۔۔

چوہدری صاحب کے مطابق برنارڈ لیوس نے مغرب کی حالیہ تاریخ کے بہت سے سیاسی سائنسدانوں جیسے ہنٹنگٹن وغیرہ پر اثرات مرتب کئے ہیں، یہ بات کافی درستے معلوم پڑتی ہے کہ کونکہ ہم دیکھتے کہ سیاسی نوعیت کے حامل مستشرقین پر برنارڈ لویس کا اثر و نفوذ کافی نمایاں طور پر دیکھا گیا ہے، جبکہ سید قطبؒ نے اخوان المسلمین (مسلم برادر ہڈ) جیسی ڈیموکریٹک مسلم قوتوں پر اثر ورسوخ چھوڑا ہے جس نے نے خود پاکستان کے مولانا مودودیؒ اور مصری مفکر حسن البناؒ سے فکری مواد اخذ کیا تھا۔ چوہدری صاحب کے مطابق کچھ حد تک سید قطب نے ان مسلم عسکریت پسندوں پر اثرات مرتب کئے ہیں جن پر پوری دنیا میں دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

ہنٹنگٹن اور تہذیبوں کے مابین تصادم کا محاکمہ:

فوکویاما نے جس کثرت سے اپنے مقالہ میں کوجیرے کو شرح الصدر کے لئے حوالہ بنایا ہے، اس سے اتنا واضح ہو گیا ہے کہ اس پر فلسفہ کا خاص اثر پایا جاتا ہے وہ مسلہ کو کافی نظری طور پر دیکھتا محسوس ہوتا ہے، اور اس نے دویار برلن کے ٹوٹنے اور سویت یونین کی افغانستان سے پسپائی کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کی جگہ عصری حادثہ کے پر دیکھنے کی کوشش کی تھی اور بہت جلد مغرب اور جمہوریت کی فتح پر اپنی فاتحانہ مابعد الطبیعات قایم کر دی تھی، اس نے اپنے تجزیہ نگاری میں اگرچہ آسولڈ اسپلنگر سے متضاد نتیجہ اخذ کیا تھا، مگر فکری انداز میں وہ اسپلنگر کی ترمیم شدہ شکل لگنے لگا تھا اور اس ضمن میں ہیگل اور اس کے شارح کوجیوے سے کافی متاثر نظر آتا ہے۔ اس کے برخلاف ہنٹنگٹن کافی ہوشیار اور چابک دست واقع ہوا ہے، مگر اس کے طریقہ تحریر پر برنارڈ لویس کا اثر ڈھونڈھنا مشکل نہیں ہوگا اگرچہ، ہنٹنگٹن کے معاملے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اس نے کھلے عام اس بات کو قبول نہیں کیا ہے کہ اس نے یہ تصور کس سے اخذ کیا تھا؟.

لیکن ایڈورڈ سعید نے اکتوبر۔ ۲۰۰۱ میں اپنے مضمون جہالت کے تصادم میں[viii] جو انگریزی موقر رسالہ دی نیشن میں چھپا تھا میں یہ جستجو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا کہ[ix]

"تہذیب کا تصادم اس کا اپنا بیان کردہ جملہ (نظریہ: نقطہ نظر) نہیں ہے بلکہ برنارڈ

لیوس سے اخذ کردہ ہے۔ لیوس کے مضمون کے آخری صفحے پر بہ عنوان: "مسلمانوں کے غصے کی جڑ" جو اٹلانٹک ماہنامہ، ستمبر: ۱۹۹۰ کے شمارے میں شائع ہوا تھا، سے اس نے یہ نقطہ نظر اخذ (سرقہ) کیا تھا لیوس نے مسلم دنیا کے ساتھ موجودہ مسایل کے ضمن میں کہا تھا کہ۔ ''ہمیں مسائل اور پالیسیوں اور ان کا پیچھا کرنے والی حکومتوں کی سطح سے آگے بڑھنے کے لیے اسلام میں ایک موڈ اور تحریک کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے. یہ امر ایک طرح سے تہذیبوں کے تصادم سے کم نہیں ہے، بلکہ یہ ہمارے کرسچن یہودی تاریخی ورثہ کے خلاف ہے۔ ہمارے سیکولر اذہان انہی دونوں ورثوں کی توسیع شدہ شکل ہیں۔ مگر ہمیں اس ضمن میں تاریخی طور پر یکساں معاندانہ رد عمل دینا سے بچنا چاہئے۔'' ہم دیکھتے ہیں کہ ہنٹنگٹن کے دو ناقد محققوں ڈاکٹر میتھیو گڈر اور ڈاکٹر نیوٹن ہاورڈ نے اس ضمن میں مندرجہ ذیل محققین اور نقادوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ہنٹنگٹن کا ناقدانہ جایزہ لے چکے ہیں، کٹی (۱۹۹۶)، ملر (۱۹۹۸)، افراسیابی (۱۹۹۹)، رسل (۲۰۰۰)، حسین (۲۰۰۱)، جونز (۲۰۰۳)، ابراہمیان (۲۰۰۳)، بلگرامی (۲۰۰۳)، فاکس (۲۰۰۳، ۲۰۰۵)۔[x]

غور طلب بات یہ ہے کہ ہنٹنگٹن نے تہذیب کی اصطلاح استعمال کی لیکن بحث میں معنی اور مفہوم ثقافت کے اختیار کئے ہیں یعنی اس نے تہذیب کو ثقافت کا مترادف تصور کیا ہے یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا تہذیبیں آپس میں ٹکراتی ہیں یا یہ ثقافتیں ہیں جو واقعی ایک دوسرے سے ٹکراتی پھرتی ہیں؟

مقالہ کا نفسیاتی تجزیہ ہمیں اس بات پر قائل کرتا ہے کہ برنارڈ لیوس کے علاوہ وہ ایک کلاسیکل تاریخی ماسٹر پیس سے بھی بہت

زیادہ متاثر تھا بلکہ کہا جسکتا ہے کہ خود لیوس کے سامنے پروفیسر ٹواین بی آرنلڈ کی شہرہ آفاق حوالہ کی کتاب **مطالعہ تاریخ** پیش نظر رہ چکی تھی، جس میں انھونے تاریخ کی ممتاز تہذیبوں کا مطالعہ ومشاہدہ کر کے ان کو متروک ومردہ قرار دیا تھا اور ان میں سے سات یا آٹھ بقیہ تہذیبوں کا ذکر کیا تھا۔ ہنٹنگٹن نے وہاں سے مسلہ لیکر سرخی جمائی کہ تہذیبیں کیوں ٹکراتی ہیں کے تحت بحث کی ہے جیسا کہ اس کا کلام بیان کرتا ہے کہ:

''(تہذیب کیوں ٹکرائے گی؟) تہذیبی شناخت مستقبل میں اہم ہو گی اور دنیا کی تشکیل بڑے پیمانے پر سات یا آٹھ بڑی تہذیبوں کے درمیان تعامل سے ہو گی جن میں مغربی، کنفیوشس، جاپانی، اسلامی (مسلم؟) ہندو، سلاوی-آرتھوڈوکس شامل ہیں۔, لاطینی امریکی اور ممکنہ طور پر افریقی تہذیب. مستقبل کے اہم ترین تنازعات، ثقافتی فالٹ لائنز کے ساتھ ان تہذیبوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کے ساتھ واقع ہوں گے''۔[xi]

ہم دیکھتے ہیں پروفیسر آرنلڈ۔ جے۔ ٹواین۔ بی نے مطالعہ تاریخ کی جلد اول میں تہذیبوں کے ان رخوں کا ذکر کیا ہے جن کا اثر و نفوذ ہنٹنگٹن کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنی آرٹیکل کی توسیع شدہ کتاب میں جو بعد میں چھپی کے حصہ دویم میں بہ عنوان تہذیبوں کے بدلتے توازن میں اسی جوہر کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اپنے آرٹیکل میں جن تہذیبوں سے مغرب کے تصادم پر خاص توجہ دی ہے وہ چینی اور اسلامی تہذیب ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے اس ضمن میں پاکستان اور چین کے تعلقات پر خاص توجہ مرکوز کی ہے اور شمالی کوریا، چین اور پاکستان کے درمیان اسلحہ سازی میں تعاون کا ذکر ہے، بلخصوص اس نے کھل کر پاکستان پر الزام عاید کیا ہے کہ اس نے شمالی کوریا سے میزایل حاصل کئے اور چین کو امریکہ سے حاصل کردہ اسٹنگر میزایل فراہم کئے تھے۔ ذیل کے عنوان کے تحت ہم ثقافت اور تہذیب کے درمیان فرق کرنے کے عمل سے گزریں گے اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ تکنیکی طور پر تصادم زیادہ تر صرف تہذیبوں اور ثقافتوں کی وجہ سے نہیں ہوتے ہیں بلکہ دیگر عوامل جیسے افراد، گروہوں، قوموں کے نظریات، تنظیمی و ریاستی سیاست کے ساتھ ساتھ اور ذاتی مفادات بھی اس کو متاثر کرتے ہیں۔

تہذیب وثقافت[xii] کی تفریق اور فکری تصادم کی سیاست:

معلوم پڑتا ہے کہ زیادہ تر ماہرین سیاسیات نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے، کہ تاریخ ماضی کی مسلسل سیاست کا نام ہے جس نے ماضی کے بیتے لمحات، واقعات، حادثات، رزم و بزم کو ارتقائی طور پر محفوظ رکھا ہے، جبکہ تہذیب ایک مادی سیاسی رجحان، صفت یا معیار کا نام ہے جو ریاست کے مختلیف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھتی ہے۔ جیسا کہ زرعی تشکیل کے بعد انسانی معاشرہ خاندان کے عمل اور مراحل سے گزرتا ہوا۔ قبائل، گاؤں، قصبے، شہر اور ریاستوں سے ہوتا ہوا، فیڈریشن اور یونین کے جدید ترین مراحل میں داخل ہو گیا تھا۔ تہذیب و تمدن کی کوئی متفقہ تعریف بیان نہیں کی گئی ہے، ہر کوئی انہیں اپنے اپنے تصور، معنی اور مفہوم میں لیتا نظر آتا ہے، چناچہ دونوں اصطلاحات کا تجزیہ اور موازنہ کرنے کے بعد ہم کچھ حد تک اس قابل ہو جاتے ہیں کہ تہذیب و ثقافت میں تفریق کر سکیں۔ بحر حال اول ہم لفظ یا صطلاح تہذیب پر غور کریں گے مابعد ثقافت پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔ یہ ایک بڑی معنی خیز بات نظر آتی ہے کہ تہذیب (سویلایزیشن)، ثقافت (کلچر) اور تصادم (کلیش) تینوں انگریزی زبان میں سی کے حرف تہجی سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ ذیل کی سطروں میں ہم ایسے الفاظ کے لسانی اور علمی سیاق وسباق اور ان کے استعمال کو سمجھنے کی کوشش کریں گے، سب سے پہلے ہم تہذیب کی طرف ایک قدم اٹھاتے ہیں۔

جب ہم چیمبرز ڈکشنری کو دیکھتے ہیں تو وہاں ہمیں یہ لفظ دو معنی بیان کرتا نظر آتا ہے:

۱۔ تہذیب ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی قابل شناخت رسم و رواج کے ساتھ ایک انفرادی گروہ کے طور پر شمار ہوتے ہیں۔

۲۔ کسی معاشرے میں سیاست، ثقافت اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے ترقی یافتہ ہونے کی حالت کا نام ہے۔[xiii]

جبکہ کولیرز ڈکشنری اس کے پانچ استعمالات بیان کرتی دکھتی ہے:

۱۔ انسانی معاشرے میں موجود ایک ریاست یا مرحلہ جس کی خصوصیات انتہائی منظم اور سماجی، اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی اور تکنیکی ترقی سے ناپی جاتی ہوں۔

۲۔ وہ ممالک اور ریاستیں جنہوں نے ترقی کی ایسی منزلیں حاصل کی ہیں۔

۳۔ خاص لوگوں کی جگہ یا وقت کا طریقہ۔

۴۔۔ مہذب بنانے یا مہذب بننے کے عمل کا عمل۔
۵۔ غیر رسمی انداز یا طرزِ زندگی جس میں وہ راحتیں شامل ہیں جن کا کوئی عادی ہے۔[xiv]

ان تعریفوں کو پڑھنے، تجزیہ کرنے اور جانچنے کے بعد یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کوئی ان اصطلاحات کو کس معنی میں استعمال کر رہا ہے، تعریف کا کون سا نمبر اس کے مقالے سے مشروط معلوم پڑتا ہے۔ لیکین معروف معنی میں یہ کسی ریاست کی ترقی اور معیارات کے اظہار کا نمونہ ہوتی ہے، جن کے دم پر وہ تاریخ میں خود کو لازوال بناتی ہے، یہ ریاستی معاشرے کے مختلیف شعبہ ہائے حیات وافکار کا احاطہ کرتی معلوم پڑتی ہے، اور اپنی کچھ منفرد اور اخذ کردہ اعلی خصوصیات کے دم پر خود کو منفرد بناتی ہیں، تہذیبیں انسانوں سے متشکل ہیں چونکہ انسان ایک فانی وجود کا نام ہے لہذا جسدی طور پر ریاست وانسان فانی ہو جاتے ہیں مگر ان کے تہذیبی کارنامے اور کاریائے نمایاں ان کو مستقبل کی اقوام کی نگاہ میں زندہ رکھتی ہیں۔

ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ:

"تہذیبوں کے درمیان اختلافات نہ صرف حقیقی ہوتے ہیں بلکہ بنیادی بھی نظر آتے ہیں، تہذیبیں تاریخ، زبانوں، ثقافتوں، روایات اور سب سے اہم مذہب کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اور ریاست، والدین اور بچے، شوہر اور بیوی کے ساتھ ساتھ حقوق اور ذمہ داریوں، آزادی اور اختیار، مساوات اور درجہ بندی کی رشتہ دار اہمیت یہ اختلافات صدیوں کی پیداوار ہوتے ہیں جو جلد ختم نہیں ہوں گے . یہ سیاسی نظریات اور سیاسی حکومتوں کے درمیان بہت زیادہ بنیادی ہیں، اختلافات کا مطلب تنازعات نہیں ہے. اور تنازعات کا مطلب تشدد نہیں ہوتا ہے، مگر صدیوں کے دوران تہذیبوں کے درمیان جتنے بھی اختلافات پیدا ہوئے ہیں انھونے اکثر و بیشتر طویل خون آشام تنازعات کو جنم دیا ہے"[xv]۔

جو بھی مذکورہ بالا اقتباس پڑھتا ہے وہ سوچ سکتا ہے کہ مصنفین نے صرف ایک اقتباس میں کتنے تضادات اور تضاداتِ فکر و نظر کا اظہار کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تہذیبیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، مگر یہ فرق حقیقی نہیں بلکہ بنیادی نوعیت کا حامل ہے، اس کے بعد وہ تہذیبوں کے بہت سے اجزاء کو شمار کرتا ہے، اور پھر اس نے بہت سی سیاسی اقدار اور مغربی تہذیب کی خصوصیات جیسے انسانی حقوق، آزادی، مساوات، سرمایہ داری وغیرہ کو متاثر کیا ہے۔

مغرب کی سب سے گہری چالاکی ہم گہرے مشاہدے سے یہ معلوم کرتے ہیں کہ اس نے اپنے کچھ مجموعی اقدر قایم کئے ہیں جن کی پورا مغرب پیروی کرتا ہے، ان میں اشتراک عمل کرتا ہے، یورپی یونین کا اتحاد اس مجموعی تاثر سیاسی نیم وفاق کے روپ میں ظہت کرتا نظر آتا ہے۔ اور اس کے لئے انھونے کچھ اقدار متشکل کئے ہیں، اس نے ریاست کو اجتماعی اقدار کا پابند کرنے کی کوشش کی ہے اور فرد کو انفرادذات میں ڈبو دیا ہے، مغرب کے تمام اقدار کی انتہا **ترقی** کے مسلسل عمل اور اس کے تغیر پر استوار نظر آتی ہے جو موجودہ عصر کا سب سے عظیم دیوتا ہے، یہ دیوتا تنقید سے بالاتر ہے، اس دیوتا کے معیارات کی درجہ بندی کے لئے عالمی ادارے اور سلطنتیں کام کر رہی ہیں، جن کی بنیاد پر کسی ملک کو ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور پست ترین ترقی کا حامل گردانا جاتا ہے۔ جدید مغربی تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت انفرادیت پسندی ہے، دوسری خاص خصوصیت، مساوات جنسی و مذہبی ہے، واضح رہے مغرب روزی کمانے کے مواقع کی مساوات کو تو کچھ حد تک مان لیتا ہے، مگر مالی و مادی تفاوت خود مغربی تہذیب کا سب سے بڑا نتیجہ ہے، تیسری بڑی خصوصیت آزادی رائے اور عمل ہے، اس دایرہ کار سے فرد نیکی اور بدی کے مذہبی اور اخلاقی معیارات کو انفرادی دایرہ کار میں ڈال کر مذہب اور اخلاقی اصولوں اور عقاید کو بس انتخاب بنا کر رکھ دیتا ہے، چوتھی بڑی خصوصیت انسانیت پرستی یعنی انسان کو خیر و شر کا پیمانہ ماننا ہے، یہیں سے ہمارا خاص مغربی آدرش انسانی حقوق پیدا ہوتا ہے، پانچویں بڑی خصوصیات سرمایہ داری، چھٹی بڑی خصوصیات، فری مارکیٹ، ساتویں بڑی خصوصیت، جمہوریت جو سرمایہ کو عوامی نمایندوں کو ایوان قانون ساز میں منتخب کر کے معاملات چلانے کے ذریعہ آئینی و قانونی تحفظ فراہم کر کے انقلاب کا راستہ روکتی ہے اور معاشیات کو قانونی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ ساتویں خصوصیت وطن پرستی آٹھویں خصوصیت سیکولرازم نویں خصوصیت صنعت و حرفت کا فروغ دسویں خصوصیت خدا سے آزادی ہے، اس تصور کو ہم نیشچے کے تصور خدا کی موت میں دیکھ سکتے ہیں،۔ کوئی فرد ممکن ہے اس فہرست کو مذید گھٹا اور بڑھا سکتا ہو مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ دیگر تمام خصوصیات بھی انہی خصوصیات کی شاخیں ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اختلاف کی نوعیتیں بدلتی رہتی ہیں، کچھ اختلاف آذلی اور ابدی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں ان میں موافقت ناممکن ہوتی ہے جیسے توحید کی شرک و کفر سے کسی بھی روپ میں مفاہمت ناممکن ہے، یہ دونوں کثرت اور وحدت کے تصورات اور عقاید ایک دوسرے سے پیٹھ موڑ کر کھڑے نظر آتے ہیں، کچھ مذہب اور فلاسفہ نے اس میں ثقافتی و نظریاتی تنوع کے نام پر مواقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جیے ہندو مذہب میں ویدانیت، تری مورتی کے تصورات، مسلمانوں میں وحدت الوجود کا تصور اور متصوفانہ افکار جن میں سے کچھ کا ماحصل یے ہے کہ اس رنگ و بو کی دنیا میں ایک ہی اذلی حقیقت رب ہے باقی سب مایہ اور نگاہوں کا دھوکہ ہے، تمام حقایقِ ظاہر یہ اسی عظیم حقیقت کے جزاوروپ کے مختلیف مظاہر ہیں، یہ فکر بھی بلنفس ہندو فلسفہ کی دین ہے، فکری تصادم شروع شروع میں غیر حربی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں جب ان فکری دعووں کو افراد کا اتبع اور تقلید حاصل ہو جاتی ہے تو مواقف کا اختلاف تنازعات کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے یوں گروہی تصادم حربی تصادم میں تبدیلی ہو جاتے ہیں۔ چناچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہنٹنگٹن کی فکر میں اسلام اور کنفیوشس ازم کو چین و پاکستان کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، اگر ہم صرف اسلام کے حقوق کی قدر و جوہریت کو لے لیں تو ہمیں ماخذاتی اختلاف کا حال معلوم پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ ہم یہاں ہزاروں پہلوؤں، اختلافات اور تصادم کو زیر بحث لا نہیں سکتے ہیں۔

حالانکہ یہ ایک سمجھی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر تہذیب کے پاس اس کا علاقہ، آبادی، ارادہ

آزادی، حکومت، غالب نظریہ حیات (اقتدار اعلی) ہوتے ہیں اور اس کے پاس اپنے مخصوص علاقہ میں رہایش پذیر شہری ہوتے ہیں، ان شہریوں کے حقوق مخصوص اقدار نامہ کی پیروی پر متعین ہوتے ہیں، ان کے حقوق اسی صورت میں محفوظ ہوتے ہیں جب کہ وہ اپنے فرایضِ شہریت فرایضِ منصبی کی طرح پورے کریں۔

حقوق کے متعلق ثقافتی اختلاف و تصادم:

اسلام و مغرب اس وقت فکری حالت جنگ میں نظر آتے ہیں، حقوق کے متعلق اسلام اور مغرب دو الگ الگ متجاد جگہوں پر کھڑے نظر آتے ہیں، سب سے اول تو مغرب کو اسلام بطور دین اور فکری نظام اور مسلمان میں تفریق کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے، دونوں اپنے طور پر مجمع انسانی کو حقوق عطا کرتے اور تسلیم کرتے نظر آتے ہیں، موافقت ڈھونڈھنے والوں کو مشابہتیں بھی مل جایں گی، اور اختلاف بھی ملیں گے چناچہ ہم ذہل تہذیبی و ثقافتی طور پر اس جوہریت کو دریافت کرنے کی کوشش کریں گے جو عیاں کرے گی کہ دونوں دبستان فکر میں سرچشموں کے ضمن میں کیا تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

اسلام کو ہنٹنگٹن اور مغرب دقیانوسی، جامد ہی صحیح ایک شاندار ماضی کے سبب تہذیب و ثقافت ماننے پر مجبور ہیں اس ضمن میں ٹواین جے آرنلڈ، برنارڈ لیوس اور ان کا مقلد ہنٹنگٹن اسے زندہ تہذیب کے درمیان تسلیم کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کیونکہ اس کا ایک اپنا ذاتی و منفرد نظامِ حقوق و فرائض موجود ہے یہ نظام الحق دو الگ الگ زمروں میں تقسیم معلوم پڑتا ہے:

ا۔ حقوق اللہ۔

۲۔ حقوق العباد (عبد اور لوگوں کے حقوق)۔

ہر تہذیب کے کچھ منفرد افکار و اعمال ہوتے ہیں جو بہ ظاہر دوسروں سے متضاد معلوم پڑتے ہیں، بلکہ ساتھ ساتھ ان کے اندر ہی ان کے نظام کی فکری موت موجود ہوتی ہے، مگر دیگر تہذیب و ثقافت سے اثرات قبول کرنے کے سبب یہ ان کو اپنے فکری زاویہ نگاہ میں جگہ دے دیتے ہیں جیسے ان میں بدھ مت اور جین مت کی اخلاقی تعلیمات، افراد کے حقوق کی وضاحت مذہبی طور پر کرتی نظر آتی ہیں حالانکہ یہ مذاہب کسی بھی اعلیٰ اور واحد خدا کے تصور سے آشنا نہیں ہیں، مگر اس غالب عنصر کو انھونے ہندو فکرِ دیو سے لیکر کام چلایا ہے، چناچہ بدھا اور ورد ھمان نے ان کے ہاں وجودِ خداوندی کی قایم مقامی قایم کی ہوئی ہے۔؟

مغرب اور اسلام کے تصور انسان میں ایک گہری تفریق و خلیج نظر آتی ہے، جس کے سبب نظریہ، شہریت، نظریہ حقوق والفرایض کے ساتھ ساتھ، انسان سے متعلقہ حقوق کی مابعد الطبیعاتی فکری تفریق نمودار ہوتی ہے، مغرب کے عوامی نمایندے انسان پرستی، یا انسانی خدائی کے نمایدنے بن کر ایوان قانون ساز جاتے ہیں، وہ لذت و ضرورت کی افادیت، مفادات کے تحفظ کے لئے انسانی اجتماع کی نیابت ایوان قانون ساز میں کرتے ہیں، یوں انسان کے حق و باطل اس کے خواہش و مفادات کے تابع ہو جاتے ہیں، یوں خیر و شر مسلسل زماں و مکان کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مغربی انسانی حقوق کا سرچشمہ سیاسی طور پر ایوانِ نمایندگان ہے جو حقوق کی سیاسی و قانونی اخلاقیات فطرت کے مادی وجود سے اخذ کرنے کے دعوے دار ہوتے ہیں، فطرت کے فلسفہ کے لئے رومانیت اور معاہدہ عمرانی کی مجموعی فکر اور درون خانہ تصادم کو دیکھا جائے تو تصادم کی نوعیت اور ان کے بدلتے رنگوں کی بابت اندازہ قایم کرنے میں آسانی محسوس ہو گی۔ جبکہ اسلامی تہذیب میں کل کاینات کا خالق، مالک، رب اللہ رب العالمیں مانا جاتا ہے، وہ ہی اپنے ارضی خلفا انبیا کرام پر وحی کے ذریعہ حقوق العباد بمعنی انسان کو متعین کرتا ہے اور عنایت کرتا ہے، یوں مغرب و مشرق کے تصور حقوق کی تفریق کچھ یوں ہے کہ انسان انسانیت پرستی کے تصور کی رو سے اپنے ایوان نمایندگان کے ذریعہ خود کو معیار بنا کر خود کو حقوق تفویض کرتا ہے، جبکہ اسلامی تصور حیات کی رو سے انسان ایک مخلوق، ایک عبد، ایک بشر ایک غلامِ الہی ہے، وہ اپنی ذات کا نا تو خود خالق و مالک ہے نا رب ہے وہ حقوق خود اپنے خالق و تخلیق کار سے لینے کا پابند ہے، جب یہ تصور ریاست کے دایرہ کار میں اترتا ہے تو ریاست کی الوہیت و سیادت کو مذہب جواب دعوی دینے لگتا ہے، جسے بلنفس ریاست آزاد وجود کے طور پر قبول نہیں کرتی ہیں یوں سیکولرازم اور کمالیت ازم پیدا ہوتے ہیں، اور ریاستت ماڈریٹ علما کی ایک جماعت قایم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے جو اپنے اقدار نامہ کو بدلنے کے لئے جدیدیت کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اس لیے ہنٹنگٹن مذہب کو تہذیب کا ایک اہم حصہ تصور کرتا ہے یہاں تک کہ وہ کسی تہذیب کو ان کے مذہبی ناموں سے منسوب کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ وہاں بہت سے غالب ایسے ثقافتی مظاہر، رسوم و رواج، رسومات اور عادات کا ایک سلسلہ موجود ہوتا ہے جو کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے ہیں بلکہ وہ صرف مادیت پسندی کے ساتھ ساتھ کسی غالب و باشعور خالق کی عدم موجودگی کی بھی عکاسی کرتے ہیں، اسی ضمن میں دیکھا گیا ہے کہ جدیدیت و فطرت سے رہنمائی پاتی ثقافتیں غیر مذہبی رجحانات اور کامل لادینیت پر یقین رکھنے کے باوجود وطن پرستی، نظریات پرستی سے متعلقہ افکار سے وہی کام لیتی نظر آتی ہیں جو اہل مذہب ان سے لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ چونکہ کسی بھی مذہب کے پیروکار کسی مخصوص عمل کرنے کے سبب اس مذہب سے منسوب کئے جاتے ہیں لہذا ہنٹنگٹن کو ہر مسلمانہ عمل کو مستشرقین کی طرح محمڈن عمل سمجھ کر اسلامی تہذیب کا عنوان استعمال نہیں کرنا چاہئے جیسے مسلم تہذیب کا ہندوستانی ثقافت سے ملاپ نے جو پل باندھنے کی کوشش کی ہے اس نے فکری اختلاف و تصادم کو وطنیت کے زیر تابع کر دیا ہے، چناچہ ہندوستان کی قدامت پسند مذہبی جماعتیں پاکستانی مذہبی قدامتی جماعتوں کے بر خلاف سیکولرازم میں ہی اپنے وجود کی فلاح تسلیم کرتی ہیں، جبھی ایک ملحد جیسے رسل بھی مسلمانوں کو عیسایوں کی طرح محمد ﷺ کی پرستش کرنے والا سمجھ کر اصطلاح محمڈن استعمال کرتا ہے، حلانکہ وہ اس امر سے واقف ہے کہ مسلمان محمد صہ کی الوہیت اور پوجا کے مدعی نہیں ہیں مگر مستشرقین کے اتباع نے محمڈن ازم بر خلاف عیاسیت کو ان ان کے جدی اذہان میں راسخ کر دیا ہے، جبھی ہندوستان میں ہندو و مسلم موافقت کو اسلامی تہذیب ماننا زیادتی ہو گی بلکہ ہم اسے

ہندوستانی تہذیب کہیں تو زیادہ عمدہ ہوگا، چناچہ ثقافتی تصادم کی جستجو کی علمی سعی کے دوران تہذیبوں کی علامت سازی اور درجہ بندی سے قبل ان کی معرفت اور ان کی دویت واختلاف کو سمجھنا کسی محقق کے لئے ناگزیر امر محسوس ہوتا ہے۔

ہنٹنگٹن، عیسائیت، مغربیت اور فکری تصادم:

ہنٹنگٹن جیسے نظریہ ساز یہاں عیسایت کو بچالے جاتے ہیں، اس کی ایک بنیادی وجہ انسانیت پرستی اور انفرادِ ذات کا اختلاف نظر آتا ہے، جو نشچے کے تصورات سے روح پاکر وجودیت پسندی میں جا داخل ہوتے ہیں، چناچہ موصوف نے مغرب کی اصطلاح پر اصرار کیا ہے اور عیسائی تہذیب کو مجہول الذات سمجھ لیا ہے، اس امر کو فراموش کر دیا ہے کہ مغربی تہذیب بلنفس عیاسیت تہذیب کا جدید بدلا ہوا نیا نام ہے، چناچہ مغربی افراد آزادی، جمہوریت، مساوات، ثقافتی تنوع، سرمایہ داری انفرادیت وغیرہ پر پختہ یقین رکھنے کے باوجود اصل اور فطرت کے اعتبار سے عیسائی ہی ہوتے ہیں اور تمام لادینیت اور مذہب گریزیت کے باوجود وہ عیسائی تہوار اور عیدوں کو بطور چھٹی مناتے ہیں، ان میں مسلم تہذیب سے نفرت و کراہت اسی ورثہ کی دین ہے. ایشیائی لوگ غلط ہیں جب وہ سوچتے ہیں کہ مغربی تہذیب کامل طور پر مخالف خدا ہے، یورپیوں کی اکثریت غلط ہے۔ خدا، عیسیٰ اور روح القدس کے پیروکاروں کے مقابلے میں ملحدین بطور مذہبی دعوی تو تعداد میں بہت کم ہیں مگر ریاستی تہذیب و ثقافت کے تناظر میں ایک اور گروہ ہیں جس کے لئے موجودہ چین اور سابقہ سویت یونین کو بطور مثال دیکھا جاسکتا ہے، اس حقیقت کے باوجود کہ ااسی مذہبی کنفیوژن کہا جاسکتا ہے مگر چین کو بھی بدھی کنفیوشس نما مذہبی تہذیب کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔

اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ مغربی تہذیبی چہرے کی اوپر بیان کردہ تمام خصائص مغربی لوگوں کے درمیان عمومی اشتراک کی عکاسی کرتے ہیں، جو ان کے مذہبی رویوں اور عقیدوں میں شامل حال ہوتے ہیں تو یہی فارمولہ دوسری تہذیبوں پر بھی منصفانہ طور پر لاگو ہونا چاہئے۔ کوئی ناقد یہاں ممکن ہے کہ یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اگر مغرب خدا سے کم متاثر تہذیب کا مجموعی اور جغرافیائی نام ہے تو عیسائی تہذیب جو بہ ظاہر خدا سے ڈرنے والی تہذیب کی دعوے دار ہے، اس کے لئے ہنٹنگٹن نے آخر کیوں سلاویک آرتھوڈوکس کی اصطلاح استعمال کی ہے؟ کیا یہ سلاوی ثقافت جس کا ماضی میں سیاسی گڑھ زار کا روس تھا اور جو سویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد روسی تہذیب و ثقافت کے روپ میں موجود ملتی ہے اسے اس نے آخر کیوں مغربی اور عیسائی تہذیب میں شامل نہیں کیا ہے؟، کیا ماضی کے غالب عیسائی مسالک کیتھولک اور پروٹسٹنٹ جو یونانی راسخ العقیدہ افراد کو بدعتی و گمراہ مانتے تھے وہ کیا تمام ذہبی فکری آزاد خیالی کے باوجود اتنے وسیع المشرب نہیں ہوپائے ہیں کہ انہیں بطور جز عیسائی تہذیب یا مغربی تہذیب کے ذیل کہیں جما سکیں؟، بلکہ یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ سلاوی آرتھوڈوکس کیا ایک باقاعدہ ایک زندہ تہذیب ہے اور اسے کے برخلاف کیا عیسائی تہذیب ایک مردہ تہذیب ہے اسی لیے اس کی جگہ مغربی تہذیب نے لے لی ہے، مغربی ثقافت اور اسلام کا ایک بنیادی فرق یہ رہا ہے کہ مغربی تہذیب میں مذہبی اور غیر مذہبی عقاید کے ساتھ ساتھ ملحدین کے لئے بھی جگہ موجود ہے جس کو ہم اصطلاح میں **ڈی ازم** اور **تھی ازم** کا اختلاف و تصادم کہہ سکتے ہیں، دونوں ہی خدا پر یقین رکھتے ہیں مگر ڈی ازم خدا کو بطور ایک خالق تو مانتا ہے مگر اسے کاینات کے معاملات سے لاتعلق مانتا ہے، یوں وہ اس رحیم و کریم بے ضرر خدا کو لاتعلق جان کر لذت و کام سے متعلقہ اخلاقی مباحث کو انفرادی معاملہ بنادیتا ہے، لہذا پارلیمان افادیتی تناظر میں انسانی خواہش کے مطابق اخلاقیات متعین کرکے اسے ایوان قانون ساز سے منظور کراکر اخلاقی قدر کا حامل بنادیتے ہیں، اس طرح یہ لوگ نیم ملحد ہو کر بھی خود کو ملحدین سے الگ کھڑا کر دیتے ہیں کیونکہ ملحد کہلانا ان کو ثقافتی و فطری تناظر میں ہضم نہیں ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ ملحد کہلانا تہذیبی تناظر میں گالی تصور کرتے ہیں، یوں مختلیف تہذیبوں اور ثقافتوں میں نرم و ملایم قوت اختلافات اور ثقافت کے روپ میں پیدا ہوتی رہتی ہیں جو آج ارتقائی طور پر ففتھ جنریشن وار کی صورت کی شکل اخیار کر چکی ہے؟.

وہ ضمرہ بندی کے تعین میں جزیہ و کلی تقسیم بندی میں یکساں اصول استعمال کرنے سے گریز کرتا نظر آتا ہے، اس ضمن میں پوچھا جاسکتا ہے کہ اس نے کیوں کہیں کسی تہذیب کو مذہب سے منسوب کر دیا ہے، جیسے اسلام، بدھ ازم، وغیرہ ور کیوں کہیں نسلی بنادیا جیسے سلاوی، کہیں فکری نوعیت کا حامل تصور کیا جیسے مغربی تہذیب اور کہیں جغرافیائی جیسے جاپانی اور افریقی تہذیبیں جیسی جیو پولیٹیکل اصطلاح استعمال کی ہے۔ حلانکہ اسے مشرقی ایشیائی تہذیبوں یا بدھ تہذیب جیسی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے تھی، مشرق بعید میں بہت سی تکنیکی ترقی یافتہ قومیں بستی ہیں، جیسے جنوبی کوریا، تائیوان، سنگاپور، ہانگ کانگ وغیرہ بلآخر آیا وہ کون سا امر ہے جو اس کی نگاہ میں چین کو تو کنفیوشسی تہذیب بناتا ہے مگر جاپان کو مختلف سمجھتا نظر آتا ہے؟ اگرچہ وہ مغربی تہذیب کی تمام خصوصیات ایشیائی نسل اور شنٹوازم کے چند عناصر کے ساتھ بانٹتا نظر آتا ہے، اس سے یہ امر بھی دریافت کیا جاسکتا ہے کہ آیا اس نے آخر کس تناظر اور اصول سے افریقی تہذیب کی اصطلاح استعمال کی ہے کیا افریقی براِعظم کا کیا کوئی مسلم اور عیسائی ہونے کے علاوہ غالب مذہبی چہرہ موجود ہے؟، بادی النظر میں افریقہ ایک براعظم ہو کر بھی مختلیف بڑے چھوٹے قبایل اور ان کی ضمنی شاخوں میں لسانی و نسلی طور پر تقسیم نظر آتا ہے چناچہ اسے اس انفرادیت کے حدودِ اربع واضح کرنی چاہئے تھی؟. پھر بغل کی تہذیبوں کی بات ہو پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ لاطینی امریکی تہذیب کو کس تناظر میں لے رہا ہے؟ جغرافیائی طور پر غالب منفرد تہذیب کے طور پر یا پھر کیتھولک تہذیب کے طور پر؟ آخر وہ کون سا امر ہے جو لاطینی امریکہ کو شمالی امریکہ سے مختلف بناتا ہے؟

بہت سارے اہم سوالات ہیں جن کے تفصیلی اور بڑے جوابات کی ضرورت موجود ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تہذیب و ثقافت کی پوری سیاست کو بیک وقت ثابت بھی کیا جاسکتا ہے اور اس کی تردید بھی کی جاسکتی ہے، درجہ بندی اور تنزلی کے تمام دعوے خود ساختہ دعووں کے سوا کچھ نہیں ہیں، ہو سکتا ہے کسی کے پاس مغربی تہذیب کے تمام فکری اشکالات کے ناقابل تردید جوابات موجود ہوں، مگر لسانی و ابلاغی فاصلوں اور لسانی عدم تفہیم کے سبب وہ ان کو پڑھ نہیں پائے ہوں، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اور دو

زبان میں ہر سطح کی فکری مناظرہ بازی کا انتہائی وسیع مواد کثرت سے موجود ہے، بلخصوص مغرب اور اس کے جید فکری مباحث پر توہزاروں کتب موجود ہیں۔
،لہذا اگر ابلاغیاتی فاصلوں اور دیگر وجوہات کی وجہ سے دعووں کے جوابات ابلاغ نہیں ہو پاتے ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس قسم کے دعوے درست ہیں اور سامنے والا لاجواب ہو چکا ہے، بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہاں مغرب ظاہراً آزادی رائے اور عقیدہ کے نام پر فکری تصادم وکشمکش کو فطری مان کر نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اس کی فکر علم سے زیادہ ملایم اور گرم حربی قوت پر کھڑی ہے،اس کی نظریاتی قوت سرمایہ دارانہ حربی جمہوریتوں کے عالمی اتحاد پر کھڑی ہے، مغرب کمزور ریاستوں اور گروہوں سے نمٹنے کا فریضہ مختلیف مفاداتی عالمی تنظیموں کو سونپے ہوئے ہے، یہ وسیلہ اس نے براہ راست لعن طعن سے بچنے کے لئے دھرا ہے،اور یہ ادارے مغرب کو کاروائی کا قانونی جواز فراہم کرتے ہیں، کیونکہ مختلیف ممالک جو ان انجمنوں کے اراکین ہیں، ان انجمنوں کے ذریعہ مختلیف معاہدہ کرکے خود کو جابرانہ اصول و ضوابط کے ہاتھوں غلام بنا چکے ہیں،اقوام متحدہ،ورلڈ بینک،آئی۔ایم۔ایف۔فاینینشل ٹاسک فورس نما ادارے اس کی خاص مثالیں ہیں۔ آپ ذرا سوچیں کہ اگر کانٹ کو انگریزی نہیں آتی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ حقیقت پسندی اور جدیدیت کے حوالے سے سوالات کے جواب دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے ان تمام باتوں کا جواب دے دیا جو آج پوچھے جاتے ہیں، ہیوم کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔

چناچہ فکری تناظر میں ایک خاص مابعد الطبیعات کی روشنی میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، یا اس کی تردید کی جاتی ہے، جن سے سوال کیا جاتا ہے اور پھر ان کا جواب دیا جاتا ہے،افراد ان افکار و نظریات کی حمایت کے لئے کمربستہ ہو کر جس طرح گروہ بندی کرتے ہیں یہ سب افکار و اعمال، درحقیقت نظریات کے تصادم کی عکاسی کرتے ہیں، ہم نے جو بھی سوال اٹھائے ہیں اور جو منظر نامہ ہم نے پیش کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی فکر ایک مسلسل سرگرمی کی علامت ہے جسے تمام انسانوں نے اپنے منفرد انداز اور چہرے کے ساتھ اشتراک پذیر کیا ہے،۔ان نظریاتی جتھے بندیوں، محاذ آرائیوں کے نتیجہ میں نظریاتی برتری اور کمتری کی لکیروں کی حد بندی کرنے کے نتیاج یہ نکلتے ہیں کہ سب معاندانہ گروہوں اور افراد کے درمیان نفرت کی پرورش شروع ہو جاتی ہے۔

یورپی تہذیب اور عصر جدید:

چناچہ جہاں ایک طرف کوئی مغربی تہذیب کو متضاد دیکھ سکتا ہے تو دوسری طرف کوئی اسے نظریاتی طور پر سراہتا نظر آتا ہے اور اسی طرح کا قائل رویہ دوسری تہذیبوں کے ساتھ بھی دیکھا جاسکتا ہے، درحقیقت یہ ایک من چاہی ذاتی تخلیق کردہ اقدار کی جنگ و کشمکش ہے جسے ہم ویلیو تھیوری کا کھیل سمجھ سکتے ہیں۔ جدید اکیسویں صدی میں واضح طور مغربی تہذیب کی دو الگ شاخیں معلوم پڑتی ہیں:

۱۔یورپی تہذیب۔

۲۔امریکی تہذیب۔

جہاں تک امریکی تہذیب کا تعلق ہے یہ درحقیقت بنیادی طور پر یورپی تہذیب کی ایک اولاد یا فرع کا درجہ رکھتی ہے، جسے علمی زبان میں یورپی تہذیب کا جدید اطلاقی چہرہ سمجھا جاسکتا ہے. اسی لیے امریکی ہمیشہ ثقافتی تنوع، لبرل ازم اور سیکولرازم کی حمایت کرتا نظر آتا ہے، جو اسے ورثہ میں برطانوی، فرانسیسی اور اسپینی ممالک سے حاصل ہوئی ہے۔ایک امریکی تہذیب کا مضبوط اندرونی پروٹسٹنٹ چہرہ ہے، جسے سرمایہ دارانہ جمہوریت سے گوندھا گیا ہے، جس کی قانونی بنیادوں کا اتا پتہ مئی فلاور ایکٹ ۱۶۲۰ سے لے کر فیڈرلسٹ پیپرز اور مکیس ویبرز کی تحریروں تک بھی اس معاملے کو سمجھنے کے لیے ڈھونڈھا جاسکتا ہے، مگر آج کل امریکی تہذیب فرع اور اولاد ہونے کے باوجود اپنی اصل مادری تہذیب مغربی یورپی تہذیب کی سیاسی اور فکری رہنمائی مین مشغول نظر آتی ہے۔

مغربی تہذیب کا اپنا ایک منفرد پیشہ ورانہ چہرہ ہے جو اس کے تصورات اور خیالات کے جسم سے دیکھا جاسکتا ہے جیسے سیکولرازم، لبرل ازم، سرمایہ داری، سائنس پرستی، الحاد، ہم جنس پرستی، ثقافتی تنوع، نسل پرستی، آئیڈیلزم، مادیت، حقیقت پسندی، جمہوری قدر۔ شہری آزادی اگرچہ یہ اصطلاحات مغربی تہذیب کی کامل شکل کا اظہار نہیں کر سکتی ہیں مگر بحر حال یہ اصطلاحات مغربی نظام کے نظریات کی چند نمایاں خصوصیات کو ضرور ظاہر کرتی ہیں۔

نوآبادیاتی دور کی جانشین برطانوی اور فرانسیسی دولت مشترکہ کی شہریت رکھنے والے شہری اگر ان اصطلاحات کو یاد رکھیں ان پر دین اور ایمان لے آئیں تو وہ مغربی فکر کی رو سے مہذب کہلا سکتے ہیں۔اور اگر ان کو حتمی سچائی کے طور پر تسلیم کر لیں تو اس قسم کے انسان، روشن خیال اور معتدل کہلانے کے حقدار تصور ہوں گے، یہ جانے بغیر کہ ایسی اصطلاحات کی علمی اعتباریت اور ان کا علمی، تاریخی پس منظر کیا رہا ہے؟ یہ بھول جانے کے باوجود کہ مغرب نے ان اصول وضوابط، فلسفہ ہائے حیات کا انتخاب فوری یا حادثاتی طور نہیں کیا تھا، بلکہ وہ ان تک پہنچنے اور اپنانے کے لئے ایک طویل ارتقائی دور سے بھی گزرے ہیں،ان کی پرورش اور نشو ونما صدیوں تک ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد کے ذریعے ہوئی تھی اور وہ انہیں قابل عمل اور کامیاب بنانے کے لیے تمام ضروری تقاضوں کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم یہ جان سکتے ہیں کہ ہنٹنگٹن تاریخ کے خاتمے کے فوکویاما کے تصور کے متعلق گفتگو سے پرہیز کرتا نظر آتا ہے لیکن اس نے بحر حال سات سے آٹھ تہذیبوں کے درمیان تصادم کو قبول کرتے ہوئے ان کا باہمی تقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے،اور وہ ساتھ ساتھ اخلاقیات کے مغربی انحطاط سے خوفزدہ اور غمزدہ دکھائی دیتا ہے۔

اگر ہم فوکویاما کے مقالے کی تصدیق کرتے ہیں جس کا مطلب ایک طرح سے دیگر آئیڈیالوجی کی موت کو قبول کرنا ہے، تو ہمیں زندہ ثقافتوں کی ضرورت پڑتی ہے، کیونکہ مغربی اصولِ انفرادیت کی رو سے ہمیں کسی مونو کلچر کی ضرورت نہیں ہے، کچھ مغربی اور مشرقی ملحدوں کے لیے خدا مردہ ہو چکا ہے تو کیا وہ فوکویاما کے پیروکار ہیں؟ اور کیا یہ لوگ یہ امر بھول جاتے ہیں کہ وہ دوسروں کو خود کی بقا کے لئے مار رہے ہیں؟ ان کے

مطابق کوئی ایسی دنیا،اس عالم و مکان کے سوا موجود نہیں ہے جہاں کوئی بیرونی خدا موجود ملتا ہو لیکن دوسری طرف خود ان کی مابعد الطبیعاتی نظریاتی بنیادوں کی رو سے ایک غیر مادی اور جسمانی خدا ان کے نقطہ نظر کی شکل میں موضوعیاتی بنیادوں پر زندہ ملتا ہے،اور وہ خدا ان کا نقطہ نظر اور موقف ہے جس پر ان کا بہ قوت اصرار ہے۔ دنیا میں بہت سے ایسے مکتبہ فکر اور مذاہب موجود ہیں جن میں کسی بھی مرکزی ہستی کو خدا کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا ہے مگر مابعد وہاں کے بانیوں اور مفکرین کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھگوان کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا جیسے بدھ مت کے بدھا، جین مت، شنتوازم، آئیکو نزم، کنفیو شس ازم وغیرہ۔

لہذا اگر کوئی کہے کہ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ، فلاں شہ صحیح ہے اور فلاں غلط ہے، فلاں فلاں امر جمہوریت مخالف ہے، کوئی امر انسانی حقوق کے خلاف ہے، اس قسم کے انفرادی بیانیوں میں وہ اس بات کی تصدیق کر رہا ہوتا ہے کہ یہی اس کا نظریاتی مذہب ہے، چناچہ مارکسسٹوں کے لیے کارل مارکس ہی ایک خدا ہے۔ لبرلز کے نزدیک کانٹ، لاک اور مل وغیرہ مشہور دانشورانہ معیار ہیں، وہ اس ضمن میں عین ایسے ہی تبلیغ کرتے ہیں، اور ویسے ہی انہیں مانتے ہیں، جیسا کہ خدا سے محبت کرنے والے پرستار کرتے نظر آتے ہیں۔ دراصل عبودیت اور پرستش کی اصطلاحات ختم کرنے کی کوشش تاحال ان کے متبادل و مترادف اصطلاحات کو ختم نہیں کر سکی ہیں، سوویت یونین اور مشرقی یورپی ممالک میں مارکسوں نے کس طرح اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کیا ان پر ریاستی جبر کیا، یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ لوگ اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لئے ہر قسم کے تصادم کو عمل میں لانا چاہتے ہیں، چاہے وہ کسی خدا کو مانتے ہوں اور چاہے کسی خدا، خالق اور مذہب کے منکر ہوں۔

لہذا خدا گریز معاشروں کو متبادل وجود کے لئے اپنا غیر الہی متبادل فراہم کرنا پڑ جاتا ہے، چناچہ اب پادریوں اور مذہبی سکالرز کی جگہ سائنس دانوں نے لے لی ہے، پوپ کی جگہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے لے لی ہے، ریاستوں کی جگہ بین حکومتی تنظیموں نے لے لی ہے، اقوام متحدہ کی جگہ جگہ ملٹی نیشنل کارپوریشنز نے لے لی ہے لہذا عصرِ جدید میں چند مذاہب کے علاوہ تمام پرانی آئیڈیالوجیز اور تھیوریز کو تبدیل کر دیا گیا ہے، نظریات ایک دوسرے سے ٹکرانے کے لیے پھر سے میدان عمل میں اتر چکے ہیں۔ ہنٹنگٹن جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فوکویاما سے زیادہ حقیقت پسندانہ موقف کا حامل نظر آتا ہے اور بہت زیادہ تنقید کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے باوجود اس نے تاریخ کے خاتمے کی پیش گوئی نہیں کی تھی، اس نے فوکویاما کے مقابلے میں فلسفیانہ سوال نہیں اٹھایا تھا اور نا ہی اس نے، فوکویاما کی طرح اپنی گفتگو کو فلسفیانہ گنجلک پن اور باطنیت کا شکار کیا تھا۔ ہنٹنگٹن ثقافت اور بین الاقوامی سیاسی اداروں کی اصطلاح میں تہذیب کی اصطلاح کو دھندلا دیتا ہے، کیونکہ اس کے خیال میں یہ قومی اور بین الاقوامی اہداف، مقاصد اور مفادات ہیں جو تہذیبوں کے درمیان تصادم پیدا کرتے ہیں، اور یہ تصادم انہیں مجبور کرتے ہیں، اور انہیں طاقت میں توازن پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ طاقت کو برابر کرنے کے لیے دوطرفہ اور سہ رخی معاہدے کرنے کا چارہ ڈالتے ہیں۔

ثقافت سے کیا مراد ہے؟

تہذیب کے بعد ہمارے پاس ثقافت کے نام سے ایک اور اصطلاح موجود ملتی ہے جو زیادہ تر تہذیب سے مشابہت رکھنے اور ہم معنی سمجھ کر بہت سے لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے وہ ثقافت کو تہذیب کے ذیلی نظام کے طور پر یا اعلیٰ رجحان کے طور پر بیان کرنے میں ناکام رہے ہیں، ثقافت تہذیب کے ذیل ہے یا پھر تہذیب کی ہم معنی ہے یہ ایک علیحدہ بحث کا تقاضہ کرتا امر ہے، ذیل میں ہم یہ امر سمجھنے کی سعی کریں گے کہ آیا ثقافت سے کیا لغوی اور فنی مراد لی جاتی ہے

چناچہ۔ چیمبرز لغت کے ایڈیٹرز ثقافت کی تعریف دوہرے تناظر میں کرتے نظر آتے ہیں:

ا۔ ثقافت ایک مخصوص معاشرہ ہے جس کی شناخت ان کے رسم و رواج، عقائد اور خاص طور پر فنون سے کی جاتی ہے۔

۲۔ ثقافت ہر قسم کے فنون پر مشتمل ہے ہوتی ہے، جیسے موسیقی، مصوری اور ادب۔[xvi]

چیمبرز کے مطابق ایک مہذب شخص اچھی طرح سے تعلیم یافتہ ہوتا ہے اور اسے فنون لطیفہ کا اچھا علم خاصہ علم حاصل ہوتا ہے، ہم ان تعریفوں سے گزرنے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ کلچر کی اصطلاح کافی مبہم نوعیت کی حامل ہے اور زیادہ تر رسم، رواج، لسان اور فنون پر توجہ دیتی محسوس ہوتی ہے، اور معاشرے کی اصطلاح استعمال کرنے سے کسی کو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کس معنی میں لی جا رہی ہے۔ ؟ایک ریاستی ثقافت کے طور پر جو فطرت کے لحاظ سے متفقہ طور پر قوم پرستانہ نوعیت کی حامل اکایوں کا اتحاد ہوتی ہے کو مشترکہ وفاق، مرکز یا وطن یکجہتی فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ریاست کی تہذیب ان جزئی ثقافتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کرتی ہے، مگر جوہری طور پر صوبائی اور دیگر جزئی ثقافتیں اکثر خود کی انفرادی شناخت لسانی اظہاریوں پر اتنا پر قوی اصرار کرتی ہیں کہ وطنی تہذیبی ثقافت سے انکا اختلاف اور ٹکراو ایک متحدہ قومی اور وطنی ریاستی ثقافت کی تعمیر کو ناممکن بنا دیتی ہے، پاکستان کی صوبائی ثقافتیں اور لسانی و نسلی بنیادوں پر استوار ثقافتوں سے عقیدت پاکستانی وطنیت کے تصور کو کمزور اور محکوم بنا کر رکھ دیتی ہیں چناچہ یہ دیکھنا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ آیا کیسے قومی سرزمین کی حدود میں رہنے والے لوگوں کے گروہوں کے درمیان. ثقافتوں کے درمیان تصادم کیسے اور کس طرح نمودار ہو رہے ہیں؟ پھر معاشرے اور تہذیب میں یہ ثقافتی تصادم پرت در پرت اور طبقاتی بنیادوں پر معاشرتی اور ریاستی مسایل کو جنم دیتی ہے۔

کولیئر کی لغت ثقافت کو چیمبرز کے برخلاف معنی دکھاتی نظر آتی ہے، بلکہ زیادہ وسیع طریقے سے بیان کرتی معلوم پڑتی ہے اس نے سات استعمالات کو بیان کیا ہے جو ذیل میں آرہے ہیں:

ا۔ اعتقادات، کارناموں اور طرز عمل کے نمونوں یا لوگوں کے گروہ کا مجموعہ، جو گروہ کے اراکین نے سماجی تعلیم کے ذریعے حاصل کیا ہو اور ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کیا گیا ہو۔

۲۔ فکری اور فنکارانہ مواد ۳. فکری اور فنکارانہ مہارت کا علم۔ ۴۔ لذت و ذایقہ اور آداب وغیرہ۔ ۵۔ تعلیمی تربیت سے ذہنی و جسمانی بہتری اور تطہیر کا عمل۔ ۶۔ ذہین میں کاشت کرنا،اس کے علاوہ بھی ایڈیٹرز نے دو مذید سائنسی معنی و مفہوم مراد لئے ہیں۔[xvii]

اس تہذیب و ثقافت کی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہے کہ تہذیب کا تعلق ایک منظم،ریاستی،سیاسی تمدن سے ہوتا ہے جس کی مخصوص آبادی کسی مخصوس علاقہ میں بستی ہو،اور جہاں یا تو ارادہ آزادی کے ذریعہ ریاست قایم ہو یا پھر اس علاقہ پر کوئی ریاستی قوت غلبہ سے قابض ہو،جبکہ اس کے برخلاف ثقادت کا تعلق ریاست سے خارج معاشرے سے لے کر ریاست کے ذیل بستے جزئی انسانی گروہوں سے استوار ہوتا ہے،ثقافت ایک روحانی قوت ہوتی ہے جو فکری،نسلی،لسانی،رسم و رواجی نوعیت کی حامل ہوتی ہے،فکر و عقاید کے اکثر تصادمات تہذیب کے برخلاف ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں،ریاستیں انضمام اور روابط کی طرف زیادہ وابستہ ہوتی ہیں جبکہ ثقافتیں انفرادیت اور علیجدگی کا رجحان رکھتی نظر آتی ہے۔ کریٹز اور کنکی[xviii] یہ امر محسوس کرتے ہیں کہ " ثقافتیں تمام سائز کی سماجی اکائیوں میں موجود پائی جاتی ہیں (تہذیبوں سے لے کر ممالک تک،نسلی گروہوں کی تنظیموں تک،کام کرنے والے گروہوں تک ملتی ہے)۔

ایڈگر سچین[xix] کا ماننا ہے کہ:

"ثقافت کی گروہ بندی کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ کثیر الجہتی ہوتی ہے، بین الاقوامی انتظامی ماہرین فین ٹروم پینیرز (نیدرلینڈ سے) اور چارلس ہیمڈن ٹرنر (برطانیہ سے) اپنی تاریخی کتاب میں یہ مداخلتی تشبیہ پیش کرتے ہیں کہ: "

ثقافت پیاز کی طرح تہوں میں آتی ہے،اسے سمجھنے کے لیے آپ کو اسے تہہ در تہہ چھیلنا پڑتا ہے،بیرونی تہہ ثقافت کی پیداوار ہوتی ہے،جیسے مین ہٹن کے نجی طاقت کے ستونوں کی بلند ہوتی ہوئی فلک بوس عمارتیں جن کے درمیان بھیڑ والی عوامی سڑکیں ہوتی ہیں۔ یہ ہیں تاثرات۔ معاشرے میں گہری قدروں اور اصولوں کی جو براہ راست نظر آتی ہیں (اقدار جیسے اوپر کی طرف نقل و حرکت "جتنا بہتر درجہ مادی کامیابی) اقدار اور اصولوں کی پرتیں پیاز کے اندر گہری ہوتی ہیں اور ان کی شناخت کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔"[xx]

کارپوریٹ آرگنائزیشنز،دیکھا گیا ہے کہ آرگنائزیشن کلچر کے تصور کو قبول کرتی ہیں،ہر آرگنائزیشن کا اپنا ایک منفرد کلچر ہوتا ہے جس میں تنوع کے تصور کے ذریعے اوپر سے پاؤں تک تمام کام کرنے والی قوتیں مختلف نسلوں،ثقافتوں،اقدار اور براعظموں سے تعلق رکھتی ایک یکساں واحد انجمن کی ثقافت کے تحت کام کرتی نظر آتی ہیں۔ انفرادی اختلافات کی میزبانی جو لوگوں کو ایک دوسرے سے مختلف اور مماثل بناتی ہے۔ بعض اوقات یہ تنظیمی کام کرنے والی قوتیں ثقافتی جھٹکوں کی لہروں کا سامنا کرتی ہیں اور ثقافتی دھچکہ بنیادی طور پر نئی توقعات اور اشارے کے زیادہ بوجھ کی وجہ سے پیدا ہونے والا اضطراب ہوتا ہے۔[xxi]

تہذیب اور ثقافت کی تعریف اور ان کے استعمال کی وسیع رینج کو پڑھنے اور اس کا حوالہ دینے کے بعد شاید یہ سمجھ میں آجائے کہ ثقافت کی اصطلاح تہذیب کی اصطلاح سے زیادہ دھندلی نظر آتی ہے. ہم خالص مورخین کے بارے میں اتنے مسایل کا شکار نہیں ہوتے ہیں کہ وہ آیا اس اصطلاح کو کس تناظر میں بروئے کار لا رہے ہیں، مگر جب ہم ماہرین سیاسیات،استشراق اور مغربیات کی طرف دیکھتے ہیں تو وہاں تہذیب و ثقافت کی اصطلاح کافی درِ سری کا باعث بنتی محسوس ہوتی ہے،عام معنی میں تہذیبیں غیر زرعی اور شہری،ریاستی تجارتی نوعیت کی حامل نظر آتی ہیں،یہ امر بھی قابل ہضم امر ہے مگر ثقافت تہذیبی پیرائے میں کافی مسایل اور علمیاتی پیچیدگیاں اور علمیاتی مسایل پیدا کرتی نظر آتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ تہذیبیں ان ثقافتوں کے مقابلے میں تنازعات پیدا نہیں کرتی ہیں جو زیادہ تر تنازعات کو راغب کرتی ہیں،اسی لیے تہذیبی تنوع کی اصطلاح کہیں نہیں سنی جاتی ہے،لیکن ہم ثقافتی تنوع کی گردان ہر سو سنتے ہیں۔ ریاستیں، بین ریاستی تنظیمیں اور ملٹی نیشنل کارپوریشنز اپنی سطح پر پوری کوشش کرتی ہیں کہ ثقافتوں سے چھیڑ چھاڑ سے پرہیز کیا جائے،ہم آہنگی کو فروغ دیا جائے تاکہ اختلافات و تنازعات سے بچا جاسکے، جس کے نتیجہ میں ہر گروہ، قوم اور ملت سے ہر سطح پر مالی سرمایہ حاصل کیا جاسکے، چناچہ چھوٹے بڑے تمام ثقافتی گروہوں کو ثقافتی کھیل تماشوں کی اجازت دی جاتی ہے،اور جب ثقافتی و لسانی اختلافات مختلیف وجوہات کے سبب تصادموں میں ڈھلتے ہیں تو امن وامان کے مسایل پیدا ہوتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف تیسری دنیا کی قومیں نو استعماریت سے نبرد آزما ہیں اور نو سامراجیت زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ مختلف تنازعات کی شکل میں مذاہب، زبان، نسل اور تاریخ وغیرہ کی شکل میں مصروف ہیں، یہ تنازعات فلسطین اور اسرائیل، بھارت اور پاکستان،ایران اور عرب، بلکہ روس اور یوکراین کے کے درمیان بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ کون سی ضروریات ہیں جو اس طرح کے ڈرامائی اضافے کو جنم دے سکتی ہیں؟ یہ شروع سے واضح نہیں ہیں، قریباً دنیا بھر میں ۶۷۰۰ زبانیں پائی جاتی ہیں جن میں سے بہت سے تیزی سے معدوم ہو رہی ہیں. کچھ کا سوال ہے کہ کیا ریاست کے ساتھ زبانوں کا تحفظ ممکن ہے؟ اور اس طرح قوم پرستی اقوام اور ان کی ثقافت کے تجزیہ میں ایک خاص عنصر کا درجہ رکھتی ہے. لوگوں کی شناخت بعض اوقات ان کی ذیلی ثقافتوں کے ساتھ مضبوطی سے جڑی ہوتی ہے،اور کسی خطہ میں انکے تصادم خون آشام صورتحال پیدا کرتے ہیں، جیسے سقوط یوگوسلاویہ کے بعد سربیائی اور بوسنیائی تصادم نسلی سے بڑھ کر مذہب تک جا پہنچے تھے۔

ثقافت و لسانیات کا اگرچہ بہت گہرا تعلق نظر آتا ہے تاہم یہ بات شروع سے واضح ہو جانی چاہیے کہ زبان کوئی عام عنصر نہیں ہے جو ایک ریاست کو دوسری ریاست سے مختلف بناتی ہے۔ ایسی بہت سی ریاستیں ہیں جو ایک ہی زبان کا اشتراک کرتی ہیں اور مختلف جگہوں پر مختلف طریقے سے بولی جاتی ہے. لسانیات تفاخر قایم کرتی ہے، چناچہ بہت سے ترقی یافتہ اقوام دنیا بھر میں اپنے لسانی تشخص پر اصرار کرتی دکھتی ہیں،اور انگریزی زبان کو جان کر بھی بولنا اپنی توہین تصور کرتی ہیں جیسے فرانسیسی، ہسپانوی،

پرتگالی، روسی، عربی اور چینی کے معاملے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ کچھ اقوام مشترک اثاثہ رکھ کر بھی مذہبی شناخت کے غلبہ کے سبب اپنی لسانی زبان کو یکساں ہونے کے باوجود منفرد بنانے کے لئے طرز تحریر میں تبدیلی لاتی ہیں جیسے اہل بھارت اپنی زبان کو ہندی کہہ کر سنسکرت دیوناگری رسم الخط میں تحریر کرتے ہیں، مگر ساتھ ساتھ انگریزی میں بات بات پر گفتگو کرکے نوآبادیاتی تاریخ سے تعلق عیاں کرتے نظر آتے ہیں اور اہل پاکستان اسے اردو کہہ کر فارسی رسم الخط میں لکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ ۱۸۶۶ میں بنارس میں نمودار ہونے والا اردو ہندی تنازعہ تھا جس نے سید احمد خان کے موقف میں تبدیلی پیدا کی تھی اور مابعد جناح تک مسلم قوم اور اردو کا بندھن تحریک آزادی کو نیا رنگ دے گیا تھا۔

ویلنسٹاین کے مطابق:

"ریاست اور زبان کے مابین تعلق درحقیقت اتنا مضبوط نہیں ہوتا ہے جتنا نظر آتا ہے (کچھ لوگوں کے مطابق). اگرچہ قوم پرستی اکثر تاریخ اور زبان کو اپنی مدد کے لئے بلاتی ہے، تنازعات کی تشکیل اور ریاست کے لیے جستجو شاید زیادہ پیچیدہ اصلیت رکھتی ہے۔ معاشرے واضح طور پر زبان کے تنوع کو کافی حد تک قابل برداشت بنانے کے قابل ہوتے ہیں اور ریاستیں بھی ایک ہی زبان کا استعمال کرتے ہوئے دوسری ریاستوں کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہیں۔"[xxii]

ہم ہنٹنگٹن کے مضمون کو دیکھ کر اندازہ قایم کر سکتے ہیں جس میں اس نے مذہب، زبان اور ثقافت کے کردار کو قبول کیا ہے جیسا کہ ہم نے متعدد تعریفوں کے ذریعے ذکر کیا ہے کہ زیادہ تر ثقافتیں رواج، روایت، قبائلی طریقوں، زبانوں اور فنون پر انحصار کرتی معلوم پڑتی ہیں[xxiii]۔ لہذا ثقافتوں اور نظریات کے درمیان حقیقی اور بنیادی تصادم کو محسوس کیا جاسکتا ہے، اور ثقافتی تنوع ایک مخصوص مکتبہ فکر سے منسلک ایک اصطلاح ہے جو ثقافتی صدمے کی لہروں کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن ثقافتی جوہریت کو بیان کرنا آسان نہیں ہوتا ہے کیونکہ ثقافت اپنی جڑیں، نسل، رسم و رواج، زبان اور تاریخی شواہد سے لیتی ہے۔

۲۰۲۴ کا سال اپنے وسط میں ہے، بھارت میں انتخابات کا آغاز ہے لیکن سیکولر ہندوستان نظریاتی اور مذہبی، ثقافتی تصادم کے جذبات سے بھرا ہوا نظر آتا ہے، اور یہ تصادم فرقوں، ذیلی فرقوں، مذاہب، ثقافتوں اور سیکولرز ہندوستانیوں اور غیر سیکولر عناصر کے درمیان کئی درجوں اور پرتوں میں جاری وساری ہے۔

چناچہ ایک مثال ہندو مذہب کے درون خانہ نظریاتی و ثقافتی ٹکراو کے ضمن میں زیر بحث لائی جاسکتی ہے، یہ ۲۰۱۵ کی بات ہے بھارت کے مشہور ماہر تعلیم اور محقق، جنکا تعلق کرناٹک سے تھا اور جن کا نام ایم۔ ایم۔ کلبرگی تھا کو ان کو ہندو مذہب میں موجود توہمات، جھوٹے عقائد، اور موتی پوجا کے خلاف تنقید و تحاریر کے سبب ان کے گھر میں گھس کر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا. جس کے نتیجے میں ایک بہت بڑا فکری اور علمی احتجاج ہوا تھا جس کے نتیجے میں ہندوستان کے نامور مصنفین سے ایوارڈ واپس لیے گئے تھے اور انھونے ایوارڈز واپس بھی کئے تھے، مشہور رائے کہ مطابق بے۔ جی۔ پی اور ہندو قوم پرست جماعتیں ان کی ان کے افکار کے سبب سخت مخالف تھیں، مزید برآں ستمبر ۲۰۱۵ کے آخر میں اس ہنگامے نے بھی زور پکڑا، جب ایک گاؤں کے ہجوم نے ایک مسلمان کو اجتماعی طور پر اس قدر مارا پیٹا تھا کہ اس کی موت واقع ہوگئی تھی اور اس کا بیٹا شدید جانکنی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اور یہ موت ایک افواہ کے سبب واقع ہوئی تھی کہ وہ اور اس کا خاندان گائے کا گوشت کھا رہے تھے مابعد وہ بکرے کا گوشت ثابت ہوا، حملے کے الزام میں دس افراد کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ہندو ویدوں کے مطابق گائے دیو (دیوتا) ہے اور دنیا اس کے سینگ پر آرام کر رہی ہے، بلکہ پورانوں کے مطابق کئی دیوی دیوتا بھی اس کے مختلیف انگ میں استھان کرتے ہیں، حلانکہ جدید محققانہ تحقیق کے مطابق قدیم آریائی گوشت خور ہوا کرتے تھے، اور دیوتاوں کو خوش کرنے کے لئے گائے اور گھوڑے کی قربانی کیا کرتے تھے، منو شاستر سے بھی اس قسم کے تاثرات معلوم پڑتے ہیں۔.

فرقہ وارانہ تشدد اور تعصب ہندوستان کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے چناچہ ۱۹۴۷ میں ہندو مسلم مہلک تقسیم ساز فسادات کے درمیان بھارت کی موجودہ سیکولر ریاست کی تشکیل ممکن ہوئی تھی جس میں ایک اندازے کے مطابق بیس لاکھ سے اوپر لوگ مارے گئے تھے کیونکہ مسلم اکثریتی پاکستان زیادہ تر ہندو ہندوستان سے الگ ہو کر برطانوی حکومت کے آخری دنوں میں بنا تھا۔ اس کے بعد سے زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وقفے وقفے سے خوفناک فسادات اور جھڑپیں شروع ہو چکی تھیں، چناچہ بھارت کے سیکولر. سائنس دان اور مورخ ایک ایسی تاریخ کو مسخ کرنے کے حوالے سے پھیلے ہوئے اضطراب کو محسوس کرتے ہیں جس کا مقصد ہندو ماضی کو شاندار بنانا ہے۔[xxiv]

پاکستان کے اندرون سندھ میں عام طور پر اور تھرپارکر میں بالخصوص حکومت سندھ اور وفاق تھر اور ملحقہ علاقوں میں پھیلی ہوئی خشک سالی کے دوران اکثر و بیشتر ہندوؤں کی ہلاکتوں کو نسبتاً کم اہمیت دیتے نظر آتے ہیں، اگرچہ اب ماضی کے مقابلے میں وہاں انفراسٹرکچر کی تعمیر اور شہری منڈیوں تک رسائی کے سبب مقامی ہندووں کی حالت میں بہتری آئی ہے، مگر ان کے ساتھ رہایش پذیر دین سے دور افراد مساجد اور عبادات سے دوری کے باوجود ان کے استحصال کو عبادت سمجھ کر سرانجام دینا سمجھتے ہیں، یا پھر وہ اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے مذہب کو ایک آلہ کار بنانے کی روش کے حامل ہیں۔ جیسا کہ یہ بڑے پیمانے پر محسوس کیا گیا ہے کہ زبانیں بعض اوقات علمیاتی ترغیبات کی حامل ثابت ہوتی ہیں جب کوئی بھی مذہبی، ثقافتی، قومی اور نسلی گروہ اور معاشرہ انہیں اظہار کے ذریعہ استعمال کرتا ہے اور جب زبانیں انہیں اپنی تاریخ یاد دلاتی ہیں تو معاملہ جذباتی ہو جاتا ہے۔ اور وہ ثقافتوں اور نظریات کی آلہ کار بن جاتی ہیں۔

ثقافت اور نظریے کے درمیان تصادم کی سیاست بعض اوقات مخصوص مکتبہ فکر سے وابستہ شخصیات کو فوری فائدے کے لیے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور ان کی نظریاتی تبدیلی کو فوری مفادات کے حصول کے ضمن میں دیکھا جاسکتا ہے، ۔ اس طرح کی مثال گاندھی کے ۱۹۴۲ کے بیان میں دیکھی جاسکتی ہے جب کرپس مشن نے

ہندوستانی سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں سے مستقبل کے فریم ورک کے لیے ملاقات کرنے کے لیے ہندوستان کا دورہ کیا تھا تو گاندھی صاحب نے مصلحت کو طلاق دے کر انگریزوں کو کہا تھا کہ :۔

"ہندوستان کو بھگوان کے ہاتھ میں چھوڑ دو، اور پھر تمام فریق ایک دوسرے سے کتوں کی طرح لڑیں گے اور جب حقیقی ذمہ داریوں کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ باہم معاہدہ کر لیں گے۔"[xxv]

کہنے کو نظریاتی گاندھی کو امن پسند انسان سمجھا جاتا ہے اور ان کا شمار آئیڈیلزم کے مکتب میں کیا جاتا ہے لیکن نظریاتی تصادم کا مشاہدہ کرنے کے بعد انہوں نے مذکورہ بالا بیان دیا تھا۔ جو سنگین خطرات سے بھرا ہوا تھا۔ اسی طرح دو بڑی ہندوستانی اقوام کا اختلاف و جدل دیکھ کر جناح نے بھی دو الگ الگ قوموں کا اعلان کیا تھا ان کو بھی دونوں بڑی اقوام کے ثقافتی و ملی اختلاف میں دن بدن اضافہ دیکھ کر ماننا پڑا تھا کہ اس کا واحد حل دو آزاد خطوں کو دونوں اقوام کے لئے تقسیم کرنا تھا وہ اسے ملکی سے زیادہ بین الاقوامی مسلہ سمجھتے تھے۔ جناح نے اپنی بائیس جون انیس سو چالیس کی تقریر میں اسی طرف اشارہ کیا تھا۔[xxvi]

ثقافتی بنیادوں پر قوموں کے درمیان تصادم کی نوعیت، تہذیبی تصادم اور سیاسی اداروں کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ اور ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ لہذا جب گروہوں اور تنظیموں کے سیاسی اور معاشی مفادات پورے نہیں ہو رہے ہوتے ہیں تو سیاسی اور معاشی فوائد پر دباؤ پڑتا ہے۔ اور قوم پرستانہ رجحانات مذید مضبوط ہوتے دکھائی دیتے ہیں جو انہیں اپنی ثقافت، روایت، رسم و رواج، زبان اور مذہب کو ذاتی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

چناچہ تصادم نہ صرف نظام اور مخالف نظریات کے درمیان وقوع پذیر ہوتے ہیں بلکہ یہ ذیلی نظام، فرقوں، ذیلی فرقوں اور ہم جنس بھائی چارے کے درمیان بھی ہو سکتا ہے، مثلاً پاکستان میں پیپلز پارٹی کے شہید بھٹو گروپ، پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمینٹری اور پی پی پی_ محب وطن کی نظریاتی جڑیں یکساں معلوم پرتی ہیں، لیکیں شخصیاتی، درونِ خانہ نسلی اور مفاداتی اختلاف کے سبب یہ دونوں باہم ایک دوسرے سے سخت حریفوں اور مخالفین کی طرح برتاؤ کرتے ہیں، عین یہی معاملہ پاکستان مسلم لیگ نواز اور مسلم لیگ (ق) کے ساتھ، ساتھ ایم۔ کیو۔ ایم۔ پاکستان، ایم۔ کیو۔ ایم۔ لنڈن اور ایم۔۔ کیو ایم حقیقی ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تصادم نے قیادت کے حوالے سے موجود ان کے مابین اختلافات کو درست نہیں ہونے دیا ہے۔ نتیجتاً ان سب کے نزدیک قیادت کا گھسا پٹا کرشمہ ساز نظریہ زیادہ اہم معلوم پڑتا ہے، اس ضمن تحریکِ انصاف اور عمران خان کو ایک نئے غالب طاقتور مثال کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ہنٹنگٹن کا خیال ہے کہ :

"ثقافتی خصوصیات اور اختلافات سیاسی اور اقتصادی اختلافات کے مقابل نسبتاً کم متغیر ہوتے ہیں جبھی ان میں مفاہمت ممکن ہے۔ سابق سوویت یونین میں کمیونسٹ جمہوریت پسند بن سکتے ہیں، امیر غریب اور غریب امیر ممکن ہے۔ لیکن روسی اسٹونین نہیں بن سکتے اور آذری آرمینی نہیں بن سکتے، طبقاتی اور نظریاتی کشمکش میں اہم سوال یہ تھا: آپ کس طرف ہیں؟؟ اور لوگ فریقوں کا انتخاب کر سکتے ہیں اور نہیں بھی کر سکتے ہیں اور پہلو بدل سکتے ہیں۔ تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ میں سوال یہ ہے کہ آپ کیا ہیں؟ جو دیا گیا ہے اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ بوسنیا سے لے کر سوڈان تک کا کس تک، اس سوال کے غلط کا مطلب سر میں گولی ہو سکتی ہے۔ نسل کے برخلاف، مذہب لوگوں کے درمیان شدید اور خصوصی طور پر امتیاز قایم کرتا ہے، ایک شخص آدھا فرانسیسی اور آدھا عرب ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی دو ممالک کا شہری بھی ہو سکتا ہے مگر یہ زیادہ مشکل ہے کہ وہ آدھا کیتھولک اور آدھا مسلمان ہو"۔[xxvii]

ہنٹنگٹن نے فوکویامی عقیدے کی تائید کی کہ مغرب دوسری تہذیبوں کے مقابلے طاقت کے عروج پر ہے کیونکہ اس کی مخالف سپر پاور دنیا کے نقشے سے مٹ چکی ہیں۔[xxviii]

لیکن اب سب جانتے ہیں کہ بہت سی طاقتیں ہیں جو امریکہ اور مغرب کا سامنا کر رہی ہیں اس کو جواب دعوی بھی پیش کر رہی ہیں، ایشیا اور مشرق ایک بار پھر ابھر رہا ہے چین، بھارت، جاپان، جنوبی کوریا، ملائیشیا، انڈونیشیا، تائیوان، ترکی، اسرائیل وغیرہ اور روس واپس ایک بڑی طاقت کے طور پر خود کو منوا چکا ہے۔ طاقت ہمیشہ طاقت ہی رہتی ہے، اس کو سنبھالنے والے ہاتھ بدل سکتے ہیں مگر یہ مستقل طور پر ہمیشہ باقی رہتی ہے اور اسے کسی فارمولے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے، دنیا میں بہت کچھ بدل چکا ہے، طاقت کے اظہار اور طریقوں میں بھی فرق آگیا ہے۔ حربی طاقت کے مقابل اب نظریات، تجارت، دولت آچکے ہیں، غیر معاشی ریاستیں بھی حربی طاقت اور آبادی کے دم پر بہت کچھ کرنے اور دکھانے کے قابل ہو چکی ہیں، جیسے پاکستان، ایران اور شمالی کوریا وغیرہ، نو۔ گیارہ کے حادثہ کے بعد کی دنیا میں دہشت گردی کے خلاف جنگ نے غیر ریاستی عناصر کی قوت اور تباہ کاری واضح کر دی ہے، امریکہ افغانستان سے واپس ہو چکا ہے، پرانے حلیف اب مفاداتی تصادم کے سبب حریف بن چکے ہیں، افغانستان اور پاکستان کی مثال اس ضمن میں کافی آسایش فراہم کرتی دکھتی ہے، حریف حلیف بن رہے ہیں پاکستان اور روس کے بڑھتے تعلقات اس کی خاص مثال ہیں۔ پاکستان اور بھارت دونوں نیوکلیئر سپلائر گروپ کے رکن بننا چاہتے تھے اگر مغرب بھارت کی حمایت کر رہا ہے تو چین نے پاکستان کو اپنی مدد کی یقین دہانی کرائی ہے اور اگر بھارت کی حمایت کی گئی تو وہ اپنا ویٹو کارڈ استعمال کرے گا۔ ایشیا دنیا کا سب سے زیادہ آبادی، معیشت اور جوہری قوت والا خطہ بن چکا ہے جہاں غیر نظر آنے والی جوہری زنجیر، بھارت، پاکستان چین اور روس کو گھیر رہی ہے۔

والے کہتے ہیں کہ : ڈاکٹر میتھیو گائیڈ اور ڈاکٹر نیوٹن ہاورڈ ہنٹنگٹن تھیوری کے جواب میں تھیوری آف پر سیپشنز

"ہنٹنگٹن کا مقالہ ثقافتی نقطہ نظر سے ابھرتا محسوس ہوتا ہے جہاں کئی پے در پے مراحل

نے وقت کے ساتھ ساتھ دنیا کو مختلف طریقوں سے تقسیم کیا ہوا ہے۔ ہنٹنگٹن نے مشورہ دیا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان بڑے امتیازات ۱۹۸۰ کی دہائی کے آخر میں ثقافتی نوعیت کے حامل نظر آنے لگے تھے۔ ہنٹنگٹن کے مطابق تہذیبی دور کے آغاز میں، بڑے فرق افراد کے درمیان اب نظریاتی، سیاسی اور معاشی طور پر نہیں بلکہ بنیادی طور پر ثقافتی طور پر نظر آتے دکھتے ہیں. نظریاتی مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے، ہنٹنگٹن نے فرض کیا ہے کہ تہذیبوں کے مابین تنازعات اور بین الاقوامی تعلق میں مذہب ہی تہذیب کی تعریف کا بنیادی معیار ہے"۔[xxix]

بنیادی طور پر تنازعہ ایک اختلاف یا جھگڑا کا نام ہے جسے دو چیزوں کے درمیان مخالفت کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے کہ عقائد یا اصولوں کا کوئی مجموعہ کلام وغیرہ[xxx]۔ تصادم کے ضمن میں جو امر قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ تصادم کے لفظ کی حدت وشدت تنازعات یا کانفلکٹ سے کم نوعیت کی حامل محسوس ہوتی ہے، مگر بحر حال ان کے متبادل استعمالات پر کوئی

فنی حدود قایم کرنا کافی مشکل محسوس ہوتا ہے۔ یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ تصادم کا تعلق زیادہ تر نظریاتی مخالفت والے لوگوں

کے مخصوص گروہ سے ہوتا ہے. جبکہ تنازعات کی اصطلاح کو قومی ریاستوں کے مابین اختلاف و معرکہ آرائی لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

مذہب پر اتنا زور کیوں؟

ہم نے دیکھا کہ ہنٹنگٹن کبھی تصادموں کو تہذیبوں کے مابین قرار دیتا ہے تو کہیں وہ ذہنی موضوعیت کے روپ میں ثقافت کو اصل گردانتا ہے، جبکہ تیسری طرف وہ مذہب کی اہمیت تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان عیاں کرنے کی کوشش کرتا معلوم پڑتا ہے، اب یہ سمجھنا ناگزیر محسوس ہوتا ہے کہ آیا مذہب سے مراد کیا ہے، وہ اسلام کے ضمن میں قومی ریاست کی جگہ، مذہب کو اسلام کے ساتھ کیوں کر منسوب کرتا دکھتا ہے ؟ مابعد الطبیعاتی تناظر میں کیا مذہبی ہونا ضروری ہے ؟ مذہب سے مراد کیا ہے جو فرد کو اپنے جانب جھکاو کے لئے مجبور کرتا ہے، کیا خدا اور اس کے دین کے بغیر کوئی مذہب، مذہب نہیں ہوتا ہے کیا عقیدت، اطاعت اور وفاداری؟ صرف الوہی مذاہب کا خاصہ ہوتی ہیں۔ جہاں تک لفظ مذہب بہ معنی انگریزی ریلیجن کا تعلق ہے یہ بذات خود لاطینی لفظ ریلیجرے[xxxi] سے اخذ شدہ ہے۔ ہم کئی ایسے دبستان فکر عالم میں دیکھتے ہیں جن کے ماننے والے کسی ان دیکھے خالق و رازق خدا کی جگہ مرکزی شخصیت پر اعتقاد قایم کرتے دکھتے ہیں اگرچہ ان کے بنیادی عقاید میں کسی اکیلے یا شرکت کار خدا کا وجود نہیں ملتا ہے، بعض کے نزدیک افکار کا مجموعہ ہی مذہب ہوتا ہے، جیسے ہندو مذہب لاتعداد تکثیری افکار و نظریات کو مجموعہ نظر آتا ہے، اس میں صدیوں کے تہوار موجود ہیں، کوئی فرد ایک خدا سے لے کر ہزاروں خداوں کو مان کر بھی ہندو کہلوا سکتا ہے، جیسے آریا سماجی، ناستک وغیرہ، کوئی ملت کسی مرکزی خدا کی عدم موجودگی میں بھی مذہبی کہلا سکتی ہے جیسے، جین مت، بدھ مت، کنفیوش ازم وغیرہ۔

ای بی ٹیلر نے مذہب کی تعریف "روحانی وجود سے متعلقہ عقائد کے طور پر کی ہے"۔ میتھیو آرنلڈ کے مطابق: "اخلاقیات جذبات کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں"۔ پروفیسر جے ای میک ٹیگارڈ کے مطابق: " مذہب خود کے اور کائنات کے درمیان ہم آہنگی اور مطابقت کا نام ہے"۔ کچھ جدید ماہرین الٰہیات مذہب کے جوہر کو اس غیبی طاقت سے منسوب کرتے ہیں جس کی بابت ہم خود میں خوف اور تعظیم کے احساس میں پائے جاتے ہیں جو یا جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہمیں راستبازی کے لیے تیار کرتا ہے۔[xxxii]

مذہب کے مقابل مغرب نے جو اصطلاح لادینی یا سیکولر تناظر میں استعمال کی ہے وہ نظریہ یا آئیڈیالوجی ہے جو بنیادی طور پر عقائد، رویوں اور تصورات کا مجموعی روپ ہوتی ہے جو سیاسی جماعت اور سماجی طبقے کے گروہ کے اراکین کی سوچ کو ہدایت اور وسیلہ فراہم کرتا ہے .[xxxiii]۔ درحقیقت مغرب اور اس کے مقلدین کے اذہان کو سیاسی فلسفہ حیات جس طرح متاثر کرتا ہے وہ مذہب کے مد مقابل سوچ کی تخلیق کرتا ہے، اس قسم کی فکری نراجیت ہمیں **نشطے** کی **کتاب زرتشت نے کہا** میں ملتی ہے، اور نشطے پھر خیر و شر کے ضمنی وذاتی ہونے سے ہوتا ہوا بلا خر خدا کی موت کے اعلان تک جا پہنچتا ہے۔

لہذا مذہب اور نظریے کی تعریف کا موازنہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ، جمہوری سرمایہ داریت نے جو روح نشاۃ ثانیہ سے حاصل کی تھی اس نے خدا اور مذہب کی جگہ فرد واحد کی رضا، خواہش اور لذت کو معبود کا درجہ دے دیا ہے، مذہب جو اجتماعی بندھن مانگتا اور قایم کرتا ہے، جدید انسان اس کو انفرادی معاملہ بنا کر جینا چاہتا ہے، اور وہ وحدت واجتماع کو بھی وطنی اور ادارہ جاتی دایرہ کار میں ڈالنے میں دلچسپی رکھتا ہے، چناچہ سیاسی و معاشی تصورات و نقطہ نظر ہی مذہب کے نعم و بدل تصور کیے جانے لگتے ہیں۔ ان افکار و نظریات میں اضدادی اصول کی طرح تصادم جاری رہتا ہے ہر ایک خود کو حق پر دوسرے کو باطل تصور کرتا ہے، دوسری عالمی جنگ کے بعد سویت یونین کے سقوط تک کا سرد دور سرمایہ داریت اور اشتمالیت کے تصادم کا دور رہا تھا، جس کے اختتام کو فوکویاما نے تاریخ کا خاتمہ قرار دیا ہے، سقوط سویت یونین تک مارکسٹوں کی نگاہ میں مارکس کا قد و قامت کسی خدا سے بھی بالاتر تھا جیسا کہ قول مشہور تھا کہ: " اگر مارکس غلط ثابت ہو سکتا ہے تو سب کچھ غلط ہونا ممکن ہے"۔ مارکسسٹوں کے لیے مارکسزم سرمایہ داری اور دانشوریت کا حتمی حل و نعم و بدل ہے اور یہ تمام نظریات کے مقابلے میں زیادہ سائنسی ہے، مارکس کے عقیدت مند اس کی پرستش کرتے ہیں، اس کا حوالہ دیتے ہیں، اس کے کام کا اسی طرح حوالہ دیتے ہیں جیسے ایک مسلمان اور عیسائی خدا، قرآن اور بائبل کو بطور حکمت پیش کرتے دکھتے ہیں۔

چناچہ ایک ملحد کے لیے اس کے عقائد اور نظریات سائنسی تحقیقات، تجرباتی اور عملیت پسندی کی روشنی میں خدا کے بغیر مذہب کی طرح ہوتے ہیں، اعتقاد اس کا بھی ہوتا ہے بس زاویہ نگاہ اور منہج مابعد الطبیعاتی بنیادوں پر بدل جاتی ہے اس لیے خدا پر یقین رکھنے والوں نے اپنے عقائد اور عقیدے کے لیے مذہب کی اصطلاح استعمال کی ہے اور غیر مومنوں نے آئیڈیالوجی کی اصطلاح استعمال کی ہے چناچہ ان کے لیے ان کے نظریے

اور نقطہ نظر ہی ان کا اپنا مذہب ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ صرف اصطلاحی سیاسی کھیل و تماشہ سے زاید کچھ نہیں ہے اور دونوں اپنے اپنے مذاہب پر یقین رکھتے ہیں، اور نظریے کا یہ تصادم ایک ہی وقت میں مذہب اور دیگر نظریات کے درمیان اندرونی اور بیرونی طور پر جاری وساری رہتا ہے اس لیے اس کا کوئی تعلق صرف مذہب سے بنتا نہیں دکھتا ہے، جیسا کہ ملحدین کا اعتراض اور وطیرہ رہا ہے۔ افکار و نظریات سے تعلق اور بندھن ہر پل تغیر زمان و مکان کے سبب بدلتے رہتے ہیں، نیا نقطہ نظر پرانے نقطہ نظر کی جگہ لے لیتا ہے، یہ تغیر اور عدم اتفاق تصادم، تنازعات اور سانحات جنم دیتا ہے، ادب میں بھی اس بابت بہت کچھ میسر آجاتا ہے۔

ٹالسٹائی کے مطابق: "جب کوئی واقعہ رونما ہو رہا ہوتا ہے تو لوگ اس کے بارے میں اپنی رائے اور خواہشات کا اظہار کرتے ہیں. اور جیسا کہ واقعات بہت سے لوگوں کی اجتماعی سرگرمی کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتے ہیں، اس لیے ظاہر کی گئی رائے یا خواہشات میں سے کسی ایک کا پورا ہونا یقینی امر ہے، لیکن تقریباً۔ جب بیان کی گئی رائے میں سے کوئی ایک پوری ہو جاتی ہے تو وہ رائے اس سے پہلے والے حکم کے طور پر جڑ جاتی ہے۔

فکری تبدیلی اور درون خانہ بے چینی پر مبنی تصادم:

چناچہ کوئی بھی فرد جس نے شیکسپیئر کے ڈرامے "ٹیمنز آف ایتھنز" کو پڑھا ہو گا وہ لارڈ ٹیمون کی فیاضانہ فطرت کو جانتا ہو گا، جس نے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی ساری دولت قربان کر دی تھی، دولت اور اخلاقیات کے حوالے سے لوگوں نے جو بھی مدد اس سے مانگی، اس نے ان کی مدد کی. لیکن جب وہ دیوالیہ ہو گیا۔ اس کی سخاوت اور خیرات کی وجہ سے ایک بندے کے سوا کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا. تو اس سانحے نے انسانیت کے حوالے سے اس کا تصور بدل دیا. اس نے ایتھنز چھوڑ کر شہر کے باہر جنگل میں پناہ لی اور تنہائی کے دنوں میں ان لوگوں سے نفرت شروع کر دی جن سے وہ محبت کرتا تھا اب ان سے محبت نہیں نفرت کا رشتہ قایم ہو گیا اسے سونے کا خزانہ تحفے ملا، لیکن اس کے سامنے اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی چناچہ اس نے وہ خزانہ ایک فوج کو اس شرط پر دے دیا کہ وہ ایتھنز کو فتح کر کے اسے زمین سے برابر کر دیں گے اور اس کے تمام باشندوں کو جلا دیں گے، قتل کر دیں گے، اس قسم کی صورتحال ہمیں جاپانی ویب سیریز: ایلس ان ونڈر لینڈ کے سیزن اول کی آخری قسطوں میں دو دوستوں کے ضمن میں دیکھنے کو ملتی ہے، نتیجا بے گناہوں کے قتل عام کی صورت میں ملتا ہے، انسان خود کی اندرونی بے چینی، بے تابی اور خلش کو دور کرنے اسے چھپانے کے لئے خود کو ظالم بنانے پر مجبور نظر آنے لگتا ہے، یوں اندرون تضادات بیرونی تصادم کا سبب بنتے ہیں جس میں جیت طاقتور اور عقل مند کی ہوتی ہے۔

ہم پھر ایلس ان ونڈر لینڈ سے لارڈ ٹیمون کی طرف آتے ہیں کہ ایتھنز کو تباہ کرنے والے بھاڑے کے فوجی کسی جوان اور بوڑھے کو اس لیے نہیں چھوڑتے تھے کیونکہ وہ سود خور تھے اور نہ ہی بظاہر مسکراتے ہوئے بچے کو کیونکہ اگر وہ بڑے ہوتے تو غدار بنتے تو جب وہ مرا تھا تو لوگ اس کی قبر پر یہ تحریر پڑھتے تھے کہ "جب تک وہ زندہ تھا سب زندہ آدمیوں سے نفرت کرتا تھا اور مرنے والے کی خواہش تھی۔ ایک طاعون باقی تمام کوائف کو کھا سکتا ہے۔ ٹیمون کی کہانی آئیڈیالوجی کو تبدیل کرنے کی کہانی ہے جو زیادہ ترنئے آئیڈیالوجی کو جنم دیتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نظریات کی تبدیلی زندگی کے تجربات اور مخصوص شخصیت، تعلق اور نظریے سے جذباتی لگاؤ کی وجہ سے ہوتی ہے. زندگی اور حقیقت کا المناک خونی چہرہ معصوموں کو ظالم بننے پر مجبور کرتا ہے. جب دولت اور طاقت چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہے تو چند امیر ہو جاتے ہیں اور اربوں غریب ہو جاتے ہیں، پھر تصادم کی نوعیت کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے یا تو نظریاتی یا مفادات کا تصادم، ایک تصادم ہے یا نہیں ہے، امیر اور غریب میں یا ترقی یافتہ اور پسماندہ میں تصادم تاحال جاری و ساری ہے۔ ادب سے ہم جب حقیقت کی طرف آتے ہیں تو یاس و قنوطیت ابھرتی محسوس ہوتی ہیں ٹیمون کی طرح جو لالچی اور مفاد پرست ایتھنز کا شکار ہوا تھا، غازی عبدالرشید کو بھی جانچا جاسکتا ہے، جس کے نظریات کی کشمکش اور تصادم نے اہم سبق فراہم کئے ہیں، یہ صاحب اسلام آباد لال مدرسہ کے محاصرے میں پاکستان کی فوج کے ہاتھوں مارے گیے تھے قدامت پسند، مذہبیوں کی نگاہ میں وہ شہید ہے اور لبرلز کی نگاہ میں سزا کا حقدار تھا کیا وہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھے؟ نہیں، اپنی کم عمری میں وہ بنیاد پرست اور مذہبی فرد نہیں تھے۔ وہ اپنی طالب علمی کی زندگی میں بائیں بازو کی طرف مائل "پیپلز سٹوڈنٹ فیڈریشن" "پاکستان پیپلز پارٹی" کے ایک طلبہ ونگ کا حصہ تھے، یہ ان کے والد کی موت تھی جس نے انہیں اپنے نظریے کا انداز بدلنے پر مجبور کیا تھا، حقیقت اور غم انسان کے نظریہ بیانیوں کو اکثر و بیشتر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ لہذا کہا جاسکتا ہے کہ ہر نظریہ اپنے پیروکاروں سے اطاعت، عقیدت، ہمت، قربانی اور اتحاد کا سوال کرتا ہے. اور مذاہب اور نظریات بیک وقت ان خصلتوں میں شراکت کاری کرتے نظر آتے ہیں، جہاں بس شدت اور حدت کی سطح میں فرق دیکھنے کو ملتا ہے، ہے، اس لیے بنیاد پرستی مذہب کی واحد خصوصیت نہیں ہے بلکہ تمام خدائی اور غیر خدائی نظریات میں بھی مشترک ملتی ہے۔

اس نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے ذرا ۱۹۲۴ کے سقوط خلافت عثمانیہ کی طرف پلٹیں اور کمالیت ازم کی طرف مراجعت کریں تو معلوم ہو گا کہ سیکولر ریاستی جبر اور مذہب کی درون خانہ کشمکش نے اگرچہ ظاہر میں ترکی کے جدید مغربی تمدنی پہلو کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ یورپ کی آزاد خیال جمہوریتیں بھی اس کے سامنے شرماتی تھیں، مگر دیہی علاقوں اور شہروں میں مذہب کے حامی بڑی تعداد میں موجود تھے، ترکی میں روایت اور جدیدیت کا تصادم جاری رہا یہاں تک کہ اردوگان کا دور آیا.

(۲۰۰۰ سے قبل کے دور) میں جب اردوگان میر کے عہدے سے سفر کر کے ترکیہ کا صدر نہیں بنا تھا تو ماضی میں ترکی کی تمام سیکولر حکومتوں نے فوج کی ہدایت پر لوگوں کو قرآن کی عربی عبارت نہ پڑھنے پر مجبور کیا ہوا تھا، یونیورسٹی میں لڑکیوں کو اسکارف پہننے کی اجازت نہیں تھی، فوجی افسران اور بیوروکریسی کو ان مذہبی خواتین سے شادی کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ داڑھی رکھنے کی اجازت نہیں تھی. کسی بھی افسر کے کمرے میں

جانماز اور کتابیں ملیں تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا تھا، ایسی ہی سنگین صورتحال کو مشہور ترک ڈرامے الف میں پیش کیا گیا ہے۔

سیاسی نظریات کا تصادم:

چنانچہ سابقہ سوویت یونین کے سقوط کے بعد کی وسطی ایشیائی ریاستوں میں یہ معاملہ زیادہ شدید نوعیت کا حامل تھا اور سوویت یونین کے انتقال کے بعد ان سوشلسٹ اور کمیونسٹوں نے لبرل جمہوریتوں اور سرمایہ دارانہ معاشروں میں پناہ لے لی تھی جنہیں وہ انسانیت کا بڑا دشمن سمجھتے تھے۔

اب ایک بار پھر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ: کیا انہوں نے اپنے ذہن اور نظریات کو تبدیل کر لیا تھا یا عبوری دور میں تقیہ سے کام لے رہے ہیں یا یہ کمیونزم کو دوبارہ دیکھنے کے لیے زیر زمین کام کر رہے ہیں؟ ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ آج کی دنیا زیادہ تر مثالیت پسندی اور حقیقت پسندی کے درمیان نظریاتی تصادم کی عکاسی کرتی دکھتی ہے۔

ہر نظریہ اور خیال سے پہلے نظریاتی اور مابعد نظریاتی چہرے اور مراحل موجود ہوتے ہیں، اگر پائتھاگورین اور پارمینیڈین نظریات افلاطونیت اور نوافلاطونیت کے مقابلے میں آئیڈیلزم کے پہلے مراحل سمجھے جا سکتے ہیں اور تصوف کو بعد کے آئیڈیلسٹ نو افلاطونی چہرے کے طور پر تصور کر سکتے ہیں۔ تو نظریاتی کشمکش کفر میں خدا اور خدائی نظریات میں کفر ڈھونڈھ کر خوش ہو سکتی ہیں، بدھا اور اوشو کا روحانی تصور خدا کے بغیر ریاضتوں میں بھی سکون ڈھونڈھ سکتا ہے خدا سے ڈرنے والا آئیڈیلسٹ بھی ممکن ہے اور ایسا عینیت پسند بھی قابل وجود ہے جو کچھ اخلاقی ضابطوں، یوگا کے طریقوں اور خدا پر یقین کیے بغیر بدھا کی طرح نروان پا سکتا ہے۔

ہیگل (1770-1830) نے شعور اور خارجی شے کا تصور ایک وحدت کی تشکیل کے طور پر کیا تھا جس میں کوئی بھی عنصر آزادانہ طور پر موجود نہیں ہو سکتا ہے. ذہن اور فطرت ایک ناقابل تقسیم کل کی دو تجریدی پہلو ہیں. اس طرح دنیا ایک مکمل نظریہ کو اپنائے ہوئے ایک وحدت کا انکشاف اور اظہار ہے۔ حیاتیات اپنی اپنی داخلی ضرورت سے مسلسل نشوونما پاتی ہے تاکہ تدریجی طور پر عقل کا مجسمہ بن سکے. فکر کے قوانین نظری طور پر حقیقت کے قوانین ہو سکتے ہیں اور منطقی طور پر قابل رد بھی ممکن ہیں، منطق کو فطرت کے تضادات کی عکاسی کرنی چاہیے. جہاں ہر چیز حقیقت و باطن میں کچھ اور ہوتی ہے، نظر بس سراب کا نام ہے تاریخ و کلچر کے مراحل سے گزر کر مطلق ذات کا ادراک ہو سکتا ہے. جن سے ایک عظیم قوم مجسم ہوتی ہے، وہ اپنی تہذیبی اور ثقافتی انفرادیتوں کی فکری بقا کے ذریعہ منفرد بن کر امر ہونا چاہتی ہیں، ہر نظام اپنی ترقی سے اس کا مخالف (اینٹی تھیسس) نظام لاتا ہے اور آخر میں ایک اعلیٰ ترکیب دونوں کو متحد اور مجسم بناتی ہے۔[xxxiv]

حقیقت پسندوں نے جوابی دلیل دی ہے کہ چونکہ واحد حقیقت اور موجودات کا مشاہدہ و ادراک ہمیں بلراست ہوتا ہے جبکہ باقی تمام موجودات ہمارے لیے صرف اسی لئے حقیقی ہیں کیونکہ ہماری ذات نے انہیں محسوس کیا ہوتا ہے اور ہمارے ذہنوں نے انہیں تعمیر کیا ہوتا ہے چنانچہ. جسم ایک ادراک تھا اور مادہ محض خیالات کا مجموعہ تھا۔[xxxv]

فلسفیانہ طور پر حقیقت پسندی اور مثالیت پسندی کا موازنہ کرنا آسان نہیں ہے بعض اوقات ایک فلسفی علمی طور پر حقیقت پسند اور عملی طور پر عینیت پسند ہو سکتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نظریاتی طور پر آئیڈیلسٹ ہوتا ہے اور کوئی عملی طور پر حقیقت پسند ہوتا ہے، مثال کے طور پر بدھ مت کے ماننے والے امن پسند ہیں لیکن وہ برما میں روہنگیا کو کس طرح نشانہ بنا رہے ہیں یہ عملی طور پر حقیقت پسند ہے۔ حکمت عملی. میں میڈیا کے آئیڈیلسٹوں کو "فاختہ" اور حقیقت پسندوں کو "ہاکس" کے طور پر شناخت کیا جاتا ہے۔ فاختہ وہ ہوتے ہیں جو کسی بھی معاملے پر نرم مفاہمت یا امن پسندانہ موقف اختیار کرتے ہیں جبکہ باز ان کے مقابلے میں جارحانہ موقف یا سخت گیر موقف کے حامی ہوتے ہیں. یہ اصطلاح امریکہ میں ویتنام کی جنگ کے حوالے سے ہونے والی بحثوں میں شروع ہوئی تھی لیکن اب اس کا اطلاق تقریباً کسی بھی قسم کی سیاسی موقف پر ہو سکتا ہے۔[xxxvi]

، تاہم. آج کل کوئی بھی جوہری طور پر صد فیصد کبوتر اور باز نما نہیں ہوتا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نظریاتی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں. دونوں نظریاتی مکاتب فکر کے درمیان اختلافات نے عالمی سیاست میں چار نظریاتی متصادم زمرے متعارف کرائے ہیں. وہ ہیں ارضی سیاست، حقیقی سیاست، نظریاتی سیاست اور مالی سیاست، اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ ریاستیں ان کو ایک دوسرے کے متبادل یا حکمت عملی کے طور پر بھی بروئے کار لاتی ہیں.

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب ریاستیں نظریات کو قبول کرتی ہیں اور وہ کسی خاص نظریے کے ذریعے گیم تھیوری کھیلتی ہیں. نتائج سرد اور گرم تنازعات کی شکل میں سامنے آتے ہیں یا تو اسے سرد جنگ سمجھا جاتا ہے یا پھر جنگ کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ۹:۱۱ سے پیرس/۱۵:۵ تک یہ سوال ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ دہشت گردی آخر کس بلا کا نام ہے یا یہ مفادات و دباو کے حصول کی سفاکانہ خون آشام فن گیری کا نام ہے، جس پر عالمی قوتیں بلواسطہ جنگ لڑنے کے لئے سرمایہ کاری کرتی ہیں، اور غیر ریاستی عناصر اس ضمن میں پراکسی وار کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔

کیا آزادی سے محروم قومیں ایسی دنیا میں آزادی حاصل کر سکتی ہیں جہاں انہیں اپنے نظام حکومت اور متعلقہ انتخابی نظام کا انتخاب کرنے کا اختیار نہیں دیا جاتا ہے؟ اور امریکہ نما عالمی طاقتیں ان کی تقدیروں کا فیصلہ کرتی پھرتی ہیں جدلیاتی مادیت سے بہت پہلے پارسی النسل زرتشت نے بھی متضاد قوتوں کے تصادم کا نظریہ پیش کیا تھا. نیکی کا دیوتا "اہورمزدا" تھا جس کو بدی کے اختتام تک بدی کے دیوتا اہرمن سے جنگ کرنی ہو گی، لیکن بالآخر فتح "اورمزد" کی ہو گی، سامی المذاہب میں نیکی و بدی کے تصادم کی ضمن میں کائنات کے اختتام سے قبل دور میں مسیح کی آمد اور دجال سے ٹکراو کی بات کی گئی ہے جسے ہندی ادب نے کالکی اوتار اور کلی یعنی دجال واسور کے روپ میں اجاگر کیا ہے۔

ہر زبان میں ایسے بہت سے الفاظ ملتے ہیں جو ایک دوسرے کی مخالفت کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے ہیں جیسے اچھا اور برا، صحیح یا غلط، سچ اور جھوٹ، سیاہ اور سفید، اوپر اور نیچے. لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر متضاد شہ لازمی ایک دوسرے کی مخالف واقع

ہو،اکثر و بیشتر یہ نظر اور فہم و فراست کی تحدیدیت اور قلت حکمت کے سبب ہوتا ہے، یہ ان کی ذاتی صفت، خصوصیت اور انفرادیت ہوتی ہے، جو ان کو دوسرے سے منفرد بناتی ہے، لہذا ہم کالے بلیک پینٹ کوٹ کے ساتھ سفید شرٹ میں زیادہ موزوں دکھ سکتے ہیں۔اس میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا ہے،اور ساتھ ساتھ کلی یا سیاہ ملبوسات بھی پہن سکتے ہیں، یہ ذہن میں موجود پسندیدگی اور عدم پسندیدگی کی لھر سے لبریز رجحانات ہوتے ہیں جو موافقت اور مخالفت کے داخلی معیار تعمیر کرتے ہیں، کیونکہ مرد بھی خواتین کی طرح حقیقی ہیں،اور وہ مردوں کی طرح حقیقی ہوتی ہیں، مگر دوسری طرف صرف ذہنی موضوعیت کی تعمیر سے خالق کی مخلوق ذہنی سراب اور التباس میں تبدیل نہیں ہو سکتی ہے،اسی طرح چاند و سورج اپنے اپنے وجود رکھتے ہیں، مگر چاند بحر حال نظمی طور پر سورج کے تابع مگر خلقی و صفی طور پر رات سے منسوب ہے، چناچہ مذاہب میں نیکی و بدی کی ایمانیات محکم نوعیت کی حامل ہوتی ہیں، مگر سیکولر تہذیب و ثقافت میں یہ انفرادی، آزاد خیال، عدم تحدیدات کے انفرادی غیر اقداری رجحان کی حامل محسوس ہوتی ہیں، ہمیں بیدار ہونے کے لیے دن چاہیے اور سونے کے لیے رات بھی چاہیے لہذا سحر پھوٹنے تک دونوں بڑی قربت کے ساتھ اپنے اپنے وجود قایم رکھ کر ایک دوسرے کو الوداع کہتے معلوم پڑتے ہیں۔

لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ نظریاتی تنازعات اور اختلافات تشدد کو جنم دیں لیکن ہم اس بات کی تصدیق بھی نہیں کر سکتے کہ تمام تنازعات کا چہرہ عدم تشدد ہے۔انسان نہ تو کامل معصوم ہوتا ہے اور نہ ہی صد فیصد لالچی اور ظالم ہوتا ہے یہ مفادات کا حصول اور ٹکراو ہوتا ہے جو مسایل پیدا کرتا ہے ،افراد اور گروہ مخصوص نظریات کا استحصال کرتے ہیں جس کے بدلے میں دہشت اور تشدد کی لہریں جنم لیتی ہیں۔

نظریاتی تصادم اور اختلاف رائے ہر اس جگہ دیکھے جا سکتے ہیں جہاں انفرادیت پسند اجتماعیت پسندوں کو قبول نہیں کرتے ہیں ، اجتماعیت پسند جایز انفرادیت کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں چناچہ سرمایہ داروں نے کمیونسٹوں کے خلاف اس وقت تک جنگ چھیڑے رکھی جب تک کہ سوویت یونین کا انحطاط نہیں ہو گیا۔

اگر سیاسی افکار کا مختصر جایزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہر طرف تضاد، اختلاف اور تصادم نظر آتا ہے،اور طاقت کی دنیا اسے ازلی، فطری اور ناگزیر جانتی ہے، مارگنتھیو کی کتاب اقوام کے مابین سیاست، ہٹلر کی مایں کیمف (میری جدوجہد)،اور چانکیہ کی ارتھ شاستر کا یہی جوہری بیانیہ ہے۔ چناچہ ایک کہتا ہے کہ انسان ہی حق و باطل کا اصل پیمانہ ہے، دوسروں کا خیال ہے کہ ریاست کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہی مقصود بلذات ہے، اسپینسر کا کہنا ہے کہ ریاست ایک حیاتیاتی وجود رکھتی ہے، دوسرے کہتے ہیں کہ یہ سیاسی نظریات کا ایک تاریخی ارتقا ہے جس نے موجودہ ریاست کو تشکیل دیا ہے۔ فوکویاما نے کہا کہ یہ تاریخ کا خاتمہ ہے یہ جاننے کے باوجود کہ بہت سے مکاتب فکر ہیں جنہوں نے ایسے نظریے کو قبول نہیں کیا ہے۔ حتیٰ کہ سوویت یونین کا انتشار بھی نہیں ہوا تھا۔ ہنٹنگٹن تہذیبوں کے ارتقاء کے ذریعے اپنی بقا کا یقین ظاہر کرتا نظر آتا ہے. چناچہ ٹواین بی اور اس کے مطابق اب مذہبی نظریات پر مبنی صرف سات سے آٹھ تہذیبیں موجود ملتی ہیں،اور ان ہی کے درمیان تصادم جاری ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا کوئی صد فیصد نظریہ موجود نہیں ہے جو مجموعی طور پر حقیقت کی تصویر کشی کرتا نظر آتا ہو، لیکن یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ چاہے سی ٹو (کلچر و سویلایزیشن) کی سیاست کی نوعیت کچھ بھی ہو، نظریات اور افکار میں نظری سائنس سے فلسفہ تک ہر سو اختلاف ہی اختلاف پایا جاتا ہے، جس کے سبب حق کی دریافت ایک مشکل امر ٹھرتی ہے۔

کانٹ نے اپنے 1784 کے مضمون میں "روشن خیالی کیا ہے؟" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ چیلنج کرنے والے لوگوں نے یہ جاننے کی جسارت کی کہ فکر اور اظہار کی بنیادی آزادیوں کو بروئے کار لانا نہ صرف شہری بلکہ اخلاقی فرض بھی ہے۔اس نے فرض کیا کہ ایک شخص روشن خیال جبھی ہو سکتا ہے اگر اس میں مولوی، ڈاکٹر اور کسی ایسے شخص کو مسترد کرنے کی ہمت ہو جو طاقت، عہدے اور وقار کے ذریعے کسی کو باندھنا چاہتا ہے، یعنی کانٹ اتھارٹی کو دعوت مقابلہ دینے والے کو روشن خیال مانتا ہے، یہ واضح رہے کہ کانٹ اس ضمن میں علمی و مذہبی حکم و منع کو جھٹلا رہا ہے نا کہ اس نے حکومت کے دایرہ کار کو رد کرنے کی طرف اشارہ دیا ہے، کانٹ کا یہ مقالہ دراصل آسان زبان میں وہ کچھ سمجھا سکتا ہے جو اسکی معرکتہ الآرا کتاب **تنقید عقل محض** دقیقیت کے سبب سمجھانے سے قاصر ہے۔

وہ کہتا ہے کہ ''روشن خیالی یہ ہے کہ انسان کا اپنے نفس کو چھوڑنا ناپختگی کا باعث بنتا ہے. ناپختگی کسی دوسرے کی رہنمائی کے بغیر اپنی ذہانت کو استعمال کرنے کی نااہلی ہے. ایسی ناپختگی خود پیدا ہوتی ہے اگر یہ ذہانت کی کمی کی وجہ سے نہیں بلکہ عزم اور ہمت کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ تو کسی دوسرے کی رہنمائی کے بغیر اپنی ذہانت کا استعمال کریں تو زیادہ عمدہ ہے، جاننے اور دریافت کرنے کی ہمت جستجو پیدا کرتی ہے، جستجو سے فرد غیر پختگی سے دستبردار ہو کر پختگی تک آتا ہے، وہ اپنی ذات کو کھوجتا ہوا حقیقت تک جا پہنچتا ہے۔[xxxvii]

نظریاتی تصادم بھی نظریات کے مابین اختلاف، دعوی جواب دعوی کے سبب مسلسل نمودار ہوتے رہتے ہیں، پھر وہ وقت آتا ہے جب یہ دبستان فکر لوگوں کے اذہان میں راسخ ہو کر عقیدہ کی شکل اختیار کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ ہم نے کانٹ کو دیکھا کہ وہ بیک وقت مذہب، روشن خیالی، رومانیت اور وجودیت پسندی کو بیان کر رہا تھا، یہ وہ دور تھا کہ جب ہابس اور لاک فوت ہو چکے تھے اور روسو اور والٹیر فرانس میں چھا رہے تھے، وجودیت پسندی کا بانی سورن کریگارڈ اس مقالہ کہ انیتس سال بعد ۱۸۱۳ میں پیدا ہوا تھا ،انقلاب فرانس میں پانچ سال باقی تھے، اب نظریاتی تصادم کا المیہ دیکھیں کہ روشن خیالی اور وجودیت پسندی نے جو کفر و شرک پیدا کیا اس کا بانی کریگارڈ خدا اور مذہب کا منکر نہیں تھا وہ چرچ اور پادری کی سیادت کا منکر تھا جبکہ اکیسویں صدی کے سارتر اور البرٹ کیموا سے کامل خدا بے زار الحاد کی طرف لے گئے، بادی النظر میں لگتا ہے کہ کانٹ تک لاک کے افکار پہنچ چکے تھے ہوبز، لاک، روسو سماجی معاہدے پر متفق ہیں لیکن نظریے کی نوعیت مختلف ہے، ہوبز کا خیال ہے کہ انسان شروع سے وحشی، قاتل اور قانون اور اصول کا منکر رہا ہے، بادشاہت جس معاہدہ عمرانی سے پیدا ہوئی ہے چونکہ

بادشاہ معاہدہ کا شریک نہیں تھا نتیجتاً مصلح قوم تھا جبھی اسے معاہدہ کسی اصول میں باندھ کر نہیں رکھ سکتا ہے، مگر چونکہ انسانوں نے باہم معاہدہ میں اس کو کلی اختیارات سونپے تھے لہذا معاشرہ اس کی اطاعت اور پیروی پر مجبور ہے۔

اگر ہوبس پر دیکھو تو لک بادشاہی کے حق میں تھا تو لوک پارلیمانی قوتوں کے حامی تھا۔ لوک (1632-1704) جبکہ ماننا تھا کہ ناہی انسان کامل وحشی تھا جیسا ہابس کا خیال ہے اور ناہی کامل مصلح اور امن پسند تھا، قدرت و فطرت خدا کی تخلیق ہیں، ان کے عطا کردہ حقوق سب کو حاصل ہیں، جبھی لوگوں نے حکومت وریاست قانون کی بالادستی، امن وامان کے لئے باہم معاہدہ کر کے قایم کی تھی لہذا بادشاہ یا حکومت عقام اور معاشرہ سے بالاتر نہیں ہیں اگر یہ عوام کے حقوق پامال کریں ان کی عزت ومال کو پامال کریں، حقوق کو ضبط کریں تو عوام کو حکومت و بادشاہ کو فارگ کرنے کا حق حاصل ہے۔

رومانیت دور عدم تہذیب کی طرف رجوع کی غماز ہے، روسو نے تہذیب کی ترقی کو جبر کا قانون سمجھا اور فطرت سے روگردانی قرار دیا، اس کے مطابق، تہذیب کی ترقی، صنعت و حرفت اور علوم کی ترویج جتنی زیادہ ہوگی انسان اتنا سادگی اور فطرت سے دور ہوتا جایگا، قانون کی زنجیریں اس پر جبر طاری کرتی رہیں گی، لہذا اس نے اپنے دور میں سائنس اور فلسفہ کی پرواز روکنے کی کوشش کی اور حالت فطرت کی طرف رجعت کو پسند کیا، مابعد جس طرح پس جدیدیت نے سائنس اور ارتقا کو بھی خام عقیدہ ،دھوکا گردانا اس سے عرصہ قبل روسو اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا اس نے بھی بڑے بیانیہ کو رد کر دیا تھا چناچہ اس نے "سائنس اور آرٹس پر گفتگو" نامی مقالہ میں اس بابت بحث کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ معاشرہ بدعنوانی کا ذریعہ ہے، روسو کے پیروکار فطرت کو صرف اخلاقی رہنما سمجھتے تھے اور تہذیب وسائنس کو فطرت اور انسانی معصومیت کا قتل تصور کرتے تھے۔

دوسری طرف ڈریڈو اور والٹیر نے روشن خیالی، فلسفہ اور سائنس کی ترقی کے لئے جھاد کیا اور ایک سائنسی تجربہ پسندی کا آغاز کیا جو روحانیت پسندوں اور سوچ کے عقلی دھارے کے خلاف تھا۔ اسی رجحان نے ڈیوڈ ہیوم کو مکمل شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیا اور جیریمی بینتھم کو ایک افادیت پسندی جس کی بنیاد لذت کے حساب سے تھی کی طرف راغب کیا. صدی کے آخر میں کانٹ کا ان فلسفوں کے خلاف رد عمل آئیڈیلزم کو فلسفہ وسائنس کی طرف لے جانے لگا تھا۔[xxxviii]

سائنس، فلسفہ اور جدیدیت میں تصادم:

سائنس اشیا کے علم کا نام ہے، جس کی دو معروف اقسام فطری و طبعی سائنس اور سماجی علوم ہیں، جدیدیت ایک نشاۃ ثانیہ کی انسانی مرکزیت کو استوار کرتی تھیوری تھی، جس کی کوکھ سے منظم طور پر نا صرف سائینسی علوم پیدا ہوئے، وجود باری تعالی کا انکار پیدا ہوا بلکہ اس نے جمہوریت، سرمایہ داریت کو پیدا کیا، اس نقطہ نظر نے انسان کو بہ حیثیت، مجموعی کاینات کی اصل، حق و باطل کو پیمانہ قرار دیا۔ خدا کی جگہ فطرت نے لے لی، اور نبیوں کی جگہ سائینسدانوں کو فایض کیا گیا، جامعات ان کا مکہ اور مدینہ قرار پائیں، چناچہ جدیدیت کی شروعات کچھ کے نزدیک، سائنس اور فلسفہ میں، کوپر نیکس، گلیلو. بیکن، اور نیوٹن سے ہوئی جہاں ایک طرف نشاۃ ثانیہ میں عقل اور حواس کو ماخذ جانا جانے لگا تھا وہیں دوسری طرف معقولات نے خود کے وجود پر ہی شک کا دایرہ وسیع کرنا شروع کر دیا تھا، چناچہ عقل کو تو کانٹ اور ہیگل نے بھی اہمیت دی تھی، مذہب کو ذاتی انفرادی معاملہ بنا کر رکھ دیا تھا مگر ساتھ ساتھ تضاد یہ ابھرا کہ تجربہ میں جو انسانی حواس کا کردار تھا اس پر سوال پیدا کر دیا، چناچہ۔ لائبنز، ہیگل اور کانٹ نے حواس کو شکوک وشبہات سے چھلنی کر کے رکھ دیا۔

جدید افکار میں دو بڑی متضاد اور متضاد حرکتیں پائی جاتی ہیں. عام آدمیوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا مکتبہ فکر درست ہے اور کون سا غیر درست ہے. اس قسم کی صورتحال نے علمی نراجیت پیدا کی اور شکوک کی گود سے خدا اور ریاست کے قوانین غیر اہم تصور کئے جانے لگے جیسا کہ نراجیت پسندوں اور اشتمالیوں کا یہ خاصہ جانچا گیا ہے۔ اب اس نراجیت کو نظم میں لانے کے لئے عبوری دور کے لئے ریاست کے جبر کو ناگزیر گردانے جانے لگا، مگر نراجیوں نے مارکسیوں کے عبوری دور کو بھی رد کر دیا اور فنی اور پیشہ ورانہ انجمنوں کو انتظام کا ذمہ دار قرار دیا۔

مادّہ، طبیعیات، میکانکس اور ریاضی کے ساتھ خارجی لفظ کے ساتھ پہلا آغاز ہوتا ہے. یہ مایوسی کے شکار فرد کی بغاوت کی نمائندگی کرتا ہے. ایک سپر نیچرل کائنات کو پڑھنے کے خلاف پہلا اور انتہائی ردِ عمل. یہ مشاہدے سے حقیقت کے قوانین وضع کرتا ہے مادّہ اور پھر مادے کے ان مشاہدات کے لحاظ سے ذہن کی ترجمانی کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کرنا مادیت، میکانزم، تعیینیت اور ایک طرزِ عمل ہے جو مادے سے شعور تک منتقل ہونے کی فطری نااہلی پر فخر کرتا ہے، اس کے ہیرو گیلیلیو،، ہوبس، نیوٹن، ڈیڈروٹ، ہولباخ،۔ لا میٹری، ہیکل، اسپینسر، رسل اور واٹسن سمجھے جاسکتے ہیں۔

مساوی اور متضاد حرکتیں شعور سے شروع ہوتی ہیں اور اپنے آپ کو اس سے گزرنے سے قاصر پاتی ہیں، یہ اندرونی دنیا میں اپنا موقف رکھتی ہے۔ ذہن، نفسیات، علمیات اور اخلاقیات کے ساتھ، یہ کائنات کے مادیت پسند تصور کے خلاف ایک انتہائی رد عمل کی نمائندگی کرتا ہے، یہ تمام چیزوں کو احساس اور تصورات کے طور پر دیکھتا ہے اور پھر مادے کو ذہن کی حالت میں لاحق کر دیتا ہے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک مذہب سے یورپ کا ایمان اٹھنے لگا تھا، مارکس، ڈارون اور فرایڈ نے جو روشن خیال خدا بے زار روشن خیال جدیدیت پیدا کی تھی، اس نے نظریاتی طور پر اتنا خوف طاری کر دیا تھا کہ، لوگوں کو خدا اور اس کا مذہب جہالت و توہم دکھنے لگا تھا، مگر اکیسویں صدی کے آغاز پر ایٹمی دایرہ کار میں تحقیق نے بیسویں صدی میں معاملہ بدل کر رکھ دیا تھا، آین اسٹاین ،ہایزل برگ اور کارل پوپر جیسے غیر مذہبی مذہب مخالف نظریہ سازوں نے سائنس کے تضادات، عدم تیقن کو واضح کرنا شروع کر دیا تھا، اہل مذہب نے جدید فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ کر کے نیا جدید علم کلام پیدا کر کے مذہب کا دفاع کرنا شروع کیا، دونوں جنگ عظیموں نے دنیا کو تباہی دکھا کر انسان کا زاویہ بدل دیا یوں جدیدیت کے بڑے عالمی دعووں اور نظریوں کے رد میں مابعد جدیدیت پیدا ہوئی،، جو اگرچہ کامل الحادی تھیوری

تھی مگر اس نے گھر سے ہی چمن میں آگ لگانے والے پیدا کرنا شروع کر دئے۔

یہ حتمی ہے جیسا کہ آج لگتا ہے،اس لیے وہ لوگ جو سائنس کے اپنے کچے علم کو مذہب پر حملہ کرنے کے لیے استعمال کر رہے تھے، بہت سے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ جدید دور میں مذہب کی کوئی حیثیت نہیں ہے .اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سے مذاہب میں بہت سی من گھڑت چیزیں موجود ہیں جو کہ حقیقت و نقل میں وجود نہیں رکھتی ہیں۔ اور وحی بھی اس میں ان کا ساتھ نہیں دیتی ہے، مگر موجودہ عصر کا فہم ان عبارتوں سے مسلہ اخذ کرنے میں ٹھوکر کھاجاتا ہے اور اپنی عزت و وقار بچانے کے لئے اپنی کم مائگی تسلیم کرنے کی بجائے ڈھٹائی سے مشکل اصطلاحوں میں جاہلانہ علمیت پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے، چناچہ جہاں عقیدہ آجاتا ہے وہاں جذبات عقل و شعور پر حاوی ہوتے جاتے ہیں،یوں محقق و غیر مقلد اذہان تحقیق و جستجو میں مصروف رہتے ہیں اور غیر محقق مقلد عامی قصہ کہانیوں سے چمٹا رہتا ہے یہ جعلی قصے و کہانیاں جو دین کی اصل نہیں ہیں پڑھے لکھے معقولیت پسندوں کو دین بے زار کر دیتے ہیں،اور یہ ناقص العقل اذہان کمزور اذہان کو کمزور تحقیق سے دین بے زار کر دیتے ہیں، یہاں یہ لوگ مجاز کو حقیقت پر محمول کر کے شکوک پیدا کرتے ہیں ،اور حقیقت کو مجاز کی طرف پھیر دیتے ہیں، یوں تفہیم دین کمزور ہاتھوں میں آکر جگ ہنسائی کا سبب بن جاتی ہے، اس قسم کے کھیل تماشے فیس بک اور یوٹیوب پر باآسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ امر فراموش نہیں کیا جائے کہ سائنسی فکر جمود کو پسند نہیں کرتی ہے وہ ہر دم تغیر و تبدیلی پر یقین رکھتی ہے،ایک ہی وقت میں کئی تحقیقات یکساں اور متضاد نتائج پر آکر قرار لیتی ہیں، ایک محقق ایک امر کو مثبت قرار دیتا ہے تو دوسرا اسے منفی گردانتا ہے، تیقن و عدم تیقن دونوں کے حامی اور مخالف یکساں طور پر ملتے ہیں، نظری سائنسدان اور عملی سائنسدان کی سوچ و فکر کی تفریق بڑے مسایل پیدا کرتی معلوم ہوتا ہے، کہ سائنسدان آخری تجربہ سے قبل مفروضات سے سفر کرتے ہیں کچھ جلدی منزل تک پہنچ جاتے ہیں کچھ کو صدیوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح لوگ نبیوں کی خبر کو ایمان لاکر قبول کرتے ہیں اسی طرح سائنسدان اور ڈاکٹر کی بات کو بھی بنا ثبوت ان کی خبر و تبصرے پر قبول کر لیا جاتا ہے، ہم سب نے ناپانی کو آکسیجن اور ہائیڈروجن سے بنتے دیکھا ہے اور نا ہر ایک نے اس تجربہ کو کبھی کیا ہے مگر نصاب کی کتاب اور استاد کی تشریح پر ہمارا کامل ایمان ہے، ہم نے جراثیم اور ایٹم نہیں دیکھے ہیں مگر ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں، جس سے ثابت ہوا کہ روحانیت کے ساتھ ساتھ سائنس بھی ایک مابعد الطبیعاتی اور اعتقادی مذہب ہے۔

اس لیے حتمی درستگی سچ ثابت ہونے سے پہلے صرف ایک خواب ہوتے ہیں، عام آدمی زیادہ تر نتائج دیکھتا ہے، وہ نہیں جانتا ہے کہ یہ نتائج اور دریافتیں ان کے سامنے کیسے ، کب اور کس طرح نمودار ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر یولی دادا کا کہنا تھا کہ:

"فلسفہ حقیقت پر چھائی ہوئی بھاری بھر کم اصطلاحات کا ایک کھیل تماشہ ہے، اگر کوئی اپنے نقطہ نظر پر سختی سے چپکا ہوا ہے تو وہ فاتح ہے اور جو پیچھے ہٹتا ہے وہ شکست خوردہ تصور ہوتا ہے"۔

عام آدمی نہیں جانتا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے وہ بس زیادہ تر مقرر کے بولنے کی قوت اور انداز، خیالات پیش کرنے کے انداز، خوبصورت اور جامع تحریر، مشکل اصطلاحات سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے عام آدمی اور عوام کو علمی مار مارنا اور دہشت زدہ کرنا معقولیت پسندوں کا شیوا بن چکا ہے۔ اس طرح کے غیر ثابت شدہ اور ثابت شدہ نظریات. علم، نظریات، نقطہ نظر کو حدود کے نیچے رکھنے کی ضرورت ہے اور کسی کو ان حدود کو عبور نہیں کرنا چاہئے اور دنیا کی ریاستوں کو ان قوموں پر اپنے پسندیدہ نظریات مسلط نہیں کرنا چاہئے جو ان کو اپنانے کو تیار نہیں ہیں، لاٹھی اور بندوق سے مہذب بنانے کی کوشش خون آشام ثابت ہوتی ہے۔

ہمیں دنیا کو ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور ترقی یافتہ اقوام کے زمرے میں تقسیم کرنے کو نظر انداز کر دینا چاہیے، یہ زمرے تیسری دنیا کے درمیان نفرت اور نفرت کی لہریں پیدا کرتے ہیں، لہذا امن اور ہم آہنگی آسان نہیں ہو سکتی ہے اس کے لیے عملی اقدامات کیے جانے چاہیں۔ امن اور ہم آہنگی کسٹرڈ اور کھیر کی طرح تیار نہیں ہو سکتی ہے، یہ ہمارے لالچ، ہوس، لذت، دولت اور جھوٹی انا کے مشترکہ ہتھیار ڈالنے سے حاصل ہو سکتی ہے اور دوسروں کا احترام کرتے ہوئے عزت، و قار ضروری ہے۔

نتیجہ:

اس عاجزانہ سے کوشش میں اس نے ہیچمدان نے اپنی کم علمی اور محدودیت کے باوجود تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، نظریاتی، مذہبی اور فکری تصادم کے کچھ پہلوؤں کا جایزہ لینے کی کوشش کی ہے، اس ضمن میں نے، ہنٹنگٹن اور فوکویاما کو مغرب یا اکسیڈینٹ کے دو نمایندہ جدید سیاسی فکر کی شخصیات جان کر زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے۔

ہنٹنگٹن کی تمثیل کا مطالعہ واضح طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ انفرادی یا اجتماعی سطح پر ادراک کی پیچیدگی کا صحیح طور پر محاسبہ نہیں کرسکا ہے. وہ کبھی تہذیب کی بات کرتا ہے تو کبھی ثقافت کی، اکثر و بیشتر ثقافت کو تہذیب کے معنی میں بیان کرتا ہے، کسی تہذیب کو مادی تناظر میں دیکھتا نظر آتا ہے تو کسی تہذیب کو نسلی و لسانی پہلو سے منسوب کرتا ہے، مگر اس نے اسلامی تہذیب کو مذہبی تناظر میں دیکھا ہے، ساتھ ساتھ وہ مذہب کو شناخت اور تہذیب کے تناظر میں خاص مقام دیتا بھی محسوس ہوتا ہے، اس کے برخلاف فلسفیانہ منہج کا حامل فوکویاما تصادم سے زیادہ مغرب کو آخری کامیاب اور ازل تک پایندہ رہنے والی تہذیب کے طور پر پیش کرتا نظر آتا ہے، چناچہ ان دونوں کی غلط فہمیوں اور ادراکی پیچیدگیوں کے سبب بحث دھندلانے لگتی ہے، اس حقیقت کے باوجود کہ یہ تصورات حقیقی دنیا میں خیالات اور اعمال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں. تمثیل پیشین گوئی کے قابل عالمی وژن کے تنوع کو سمجھنے کے لیے ایک اصول کے تصور کے امتزاج پر انحصار کرتی ہے۔ ادراک کے نمونوں کے وجود پر زور دیتے ہوئے ارادے یا رویے، افراد اور گروہوں کے لیے غالب تصورات کا وجود جو ان کی سوچ کی وضاحت کرتا ہے اور مستقبل کے رویوں کی پیشین گوئیوں کو قابل بناتا ہے۔[xxxix]

مختلف معاشروں اور اداروں کے اثرات اس تقسیم پر لاگو ہوتے ہیں . یہ سب شاید

زندگی کی غلطی کے امکان کا تازہ ترین رد عمل ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سیاسی فلسفہ میں خاص طور پر اور عمومی فلسفہ میں عام طور پر اتنا زیادہ اختلاف، تنوع اور تغیر ملتا ہے کہ فلسفہ سے حق کی تلاش کی جستجو ناکامی کا شکار ہونے لگتی ہے، اہل مغرب کی انفرادیت اور ان کے موقف کے تغیر نے اتفاق کا دعوی ناممکن بنا دیا ہے، اگرچہ رواج کی رو سے کچھ اتفاقات پائے جاتے ہیں، مگر انحراف کے شوقین اور آزادی کی عدم تحدید کے شوقین نفسیاتی امراض اور درون خانہ پیچیدگی کا اس قدر شکار ہو جاتے ہیں، کہ چھوٹے چھوٹے کم عمر بچے ذرا ذرا سی بات پر یورپ اور امریکہ میں اپنے ہم جماعتوں اور استادوں کو خون میں نہلا دیتے ہیں، ایلون ٹوفلر کی کتاب **عظیم دھچکہ** یا صدمہ مغربی تہذیب کی عام حیات میں پائے جانے بے چینی، بے تابی اضطراب کا اظہار کرتی ہے۔ جو تہذیبیں اور افراد مغربی افکار اور رجحان کا شکار ہوتے ہیں ان میں دن بہ دن نفسیاتی مسایل اور بیماریاں پھیلتی جاتی ہیں، جاپان میں لوگ کام کر کر کے اتنے بے زار ہو چکے ہیں کہ وہ اچانک غایب ہو جاتے ہیں، اور سکون کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے لگتے ہیں، بقیہ کام کے بغیر رہ نہیں سکتے ہیں، مگر اندر سے خوش بھی نہیں ہوتے ہیں چناچہ خودکشیاں وہاں عام ہیں۔ چین میں شہروں میں کام کرنے والے، اپنے بچے ماں باپ کے پاس چھوڑ کر سالوں آفسوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے بچے ماں باپ کی محبت کو ترستے رہتے ہیں، جدید انسان کاروبار اور تجارتی سرگرمیوں میں پھنس کر اخلاق کو دولت کے حصول کے تابع کر دیتا ہے، یوں پیشہ وارانہ حیات کا مطلب ہے، دولت کے کمانے کی اخلاقیات اور یہاں کوئی رشتہ و تعلق دولت کے بغیر ادھورا رہتا ہے۔ مرد کی زندگی کے چالیس سال تعلیم، روزگار اور دولت کے حصول میں ضائع ہو جاتے ہیں خود کو کامل اور اکمل بنانے کے چکر میں اس کی شادی کی عمر نکلنے لگتی ہے، اور وہ ادھیڑ عمر ہوتا جاتا ہے، مرد تو کسی نا کسی طرح خود کو اولاد پیدا کرنے کے قابل بنا لیتا ہے مگر چالیس پینتالیس سال کی عورت کی بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق تیس سے پینتیس سال کی پونے دو کروڑ لڑکیاں پاکستان میں شادی کے بغیر موجود ہیں، اور اس سے نصف پینتیس سے پینتالیس غیر شادی شدہ خواتین کی ملتی ہے۔ انسانی تہذیب اور تمدن میں کبھی ایسا وقت نہیں آیا ہے کہ روٹی، کپڑا، مکان، شادی اور روزگار عام آدمی کی دسترس سے باہر نکلا ہو، حلال شادی اور جایز جنسی آسودگی مال و دولت، مقام کے حصول کی جنگ نے ناممکن بنا دی ہو۔ فوکویاما کا آخری آدمی انسانیت کے زوال کے دور کا مردہ انسان ہے، جو آسایشوں کا بھوکا، ہوس کا بچاری اور لذت کا غلام بن چکا ہے۔ سوشل سایینس نے انسان کو سوشل کم مادی اور مفاد پسند زیادہ بنا دیا ہے، اس کی انا اس کو عالم بنانے کا یقین دلاتی نظر آتی ہے، وہ اپنی انا کی پوجا کرتے کرتے خود کو اتنا مافوق البشر سمجھ چکا ہے کہ اس کو مطالعہ، تحقیق اور جستجو کی جگہ خود میں معیار کے پنہاں ہونے کا یقین ہونے لگا ہے، یہ پوسٹ ماڈرن انسان کبیر و صغیر بیانیوں سے آگے اپنی انفرادیت کو محور بنا کر، حقیقت کے ادراک سے قاصر ہے، سوشل میڈیا نے معیاری علم و تحقیق کو عام آدمی کا بازاری کاپی پیسٹ علم و تحقیق بنا کر رکھ دیا ہے، انفارمیشن بہت زیادہ ہو چکی ہے، مگر اس میں معیاری کام کی بات نا ہونے کے برابر ہے۔ کسی بھی تحقیق کو ویور شپ کے ذریعہ تباہ کرنا ممکن ہے۔ اس قسم کا خواب نافوکویاما کو مرغوب تھا اور نا ہنٹنگٹن کو قبول تھا۔ کیونکہ نظریات اب نظریات سے زیادہ عام آدمی کی شرح بن چکے ہیں، دراصل بڑے علمی بیانیوں کے رد کی جو راہ مابعد الجدیدیت نے دکھائی تھی سوشل میڈیا نے اسے اب محدود انفرادی آرا میں بدل دیا ہے، ہر فرد آج خود اپنا رب اور خود اپنا پیغمبر بن چکا ہے، اور ٹیوٹر اور ایکس نے یہ کام ممکن بنا دیا ہے۔ اس طرح دنیا میں انفرادی تصادم کی سطح گوگل اور فیس بک کے سبب بڑے اجتماعی تصادم سے بڑھ چکی ہے، ابھی حال ہی میں ڈی۔ ڈبلیو کی تحقیق نے سایینسی ریسرچ پیپرز کی دھاندلی عام کی ہے جس کی رو سے لوگ تحقیقی مقالات بڑھانے کے چکر میں غیر معیاری جعلی پیپرز لکھ کر چھپوا رہے ہیں جو بعد میں فضول ثابت ہوتے ہیں اور بد قسمتی سے اس نے اول مقام سعودیہ عربیہ کو دوسرا پاکستان کو دیا ہے، یہ رپورٹ کتنی سچی اور کتنی متعصبانہ ہے یہ ایک الگ بحث ہے مگر کم از کم پاکستانی جامعات کے محققین دل میں اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ایسے علمیاتی کھیل تماشے، سرقہ بازی بہت عام بات ہو چکی ہے۔ تھیوری آف ویلیو پر صحیح طریقے سے توجہ نہیں دی گئی ہے، ہر قدر کو مثبت یا منفی کے طور پر نشان زد کیا جا سکتا ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی ایک کا مخالف تھیسس پیش کرے اور کوئی ترکیب کے ذریعے ان مخالف نقطہ نظر کی نظریاتی شدت کو بے اثر کرنا چاہتا ہو۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر فلسفی اور نظریے کا نظام ترکیب پر مبنی ہوتا ہے. یہ خود ساختہ خود کار نظریات ایک دوسرے سے اس قدر متضاد واقع ہوتے ہیں کہ عام آدمی اور سائنسدان خدا اور مذہب پر دوبارہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ ان کے مخالف نظریات آخر کار بڑی وسعت میں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے سامعین کی وسیع تعداد کو مطمئن نہیں کیا ہے، ظاہر و باطن، جوہر و عرض میں مطابقت کم تضاد بڑھتا جا رہا ہے، یوں قلبی انقاد اور مذہبی عقیدہ بے چین قلب و روح کے سکون کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔

ایک مرد کو امن اور خوشحالی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ لاکھوں صفحات اور جلدیں پیش کرنے کے بعد اپنی عزت اور تمام نظریات کو برقرار رکھنا چاہتا تھا، فلسفیوں اور سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد، حقیقت یہ ہے کہ خامیوں سے کم نظریات فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے، ان کی ساری تحقیقات ان کے نقطہ نظر کی علمی وقعت پر استوار ہوتی ہیں، کارل پوپر کو ہر نظریہ اس وقت تک غلط لگتا ہے جب تک تجربات، مشاہدات و تحقیقات سے وہ صحیح ثابت نا ہو جائے، لہذا یہاں اور وہاں گھومنے کے بعد لوگوں کی اکثریت مذہب کی طرف آخری عمر میں میلان ظاہر کرنے لگی ہے، جستجو و تحقیق میں صحرا گردی کے معلوم ہوتا ہے کہ حق و سچ تو قریب تھا ہم کہاں بھٹک کر دور چلے گئے پاولو کوہلیو کے الکیمسٹ نامی ناول کا مرکزی خیال بھی اسی قسم کا نظر آتا ہے، مشرق ترقی کی دوڑ میں خدا سے دور ہو رہا ہے اور مغرب سکون کی تلاش میں خدا کی طرف دیکھنے لگا ہے۔ یوں تصادم اور تضادات کے محل و وقوع بدلنے لگے ہیں۔

ہنٹنگٹن فوکویاما کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ اور میکاولین معلوم پڑتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ: مغرب کو دیگر تہذیبوں، مغربی اقدار اور مفادات سے ہمدردی رکھنے والے

گروہوں کی حمایت کے لیے کنفیوژن پیدا کرنی چاہئے اور اسلامی ریاستوں کے درمیان اختلافات اور تنازعات کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ہنٹنگٹن سامعین سے مستقبل کی لڑائی کے لیے تیار ہونے کا مطالبہ کرنے میں بالکل واضح ہے جو مشرقی اور مغرب کے درمیان لڑی جائیگی۔ 11/9 سے پیرس/15/11 تک کے اشارے یہ بتا رہے ہیں کہ تنازعہ شروع ہو چکا ہے اور قیامت کے دن تک ہنٹنگٹن اور اس کے ساتھی مفکرین ریاستی و تہذیبی بالادستی کے لئے اپنے مقلدین کے ذریعہ مسلسل مقابلہ جاری رکھیں گے، ۲۰۲۳ سے اکتوبر کے درمیان اسرایل اور حماس کی لڑائی میں کل غزہ صفحہ ہستی سے مٹ چکا ہے، فلسطینی پناہ گزینوں کو اب وہ رفاہ میں نیست و نابود کرنے کی کوشش میں مگن ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ امریکہ اور یورپ کی آشیر واد سے کل فلسطینی علاقے اسرایل کے قبضے میں ہوں گے، اور فلسطینیوں کی قلیل تعداد ریفرنڈم میں اپنا وطن ہار جائیگی یہی ماجرا بھارت کشمیر کے ساتھ کرے گا۔ اگر چہ ہنٹنگٹن نے کسی روسی تہذیب کا نام نہیں لیا ہے، لیکن کمیونزم کے خاتمے کے بعد روسی ایک بار پھر یونانی آرتھوڈوکس چرچ کی قیادت کے ساتھ اپنے کندھوں پر واپس آگئے ہیں یعنی کہ روس میں خدا آچکا ہے اور مشرق میں نظریہ بدر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ترکی کمالیت ازم سے نجات حاصل کر رہا ہے، مگر بھگوان مودی کی ترقی یافتہ اقدار کا انجن بن چکا ہے۔ جبکہ پاکستانی سوشل میڈیا پر خدا اور خد کے بغیر دنیا کے لئے تصادم میں مشغول ہیں۔

جب کوئی کسی چیز کو سائنسی کہتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کسی چیز کا نام لینے اور پکارنے کا مطلب ہے کہ سامعین اس رجحان کو نابینا اور ناخواندہ آدمیوں کی طرح سائنسی مان لیں گے. سائنس کے نام پر جو کچھ بھی پیش کیا گیا ہے وہ زیادہ تر لوگوں کو بے وقوف بنانے کی عقایدی کوشش ہوتی ہے، اسی طرح کوئی فرد کرپٹ ہو کر سامنے والے کو کرپٹ کہہ کر اخلاقی طور پر دھل نہیں سکتا ہے، کیونکہ دونوں کے ضمیروں میں بدعنوانی اک اندرانی حقیقی احساس ظاہر میں حقیقت کو دھندلا سکتا ہے مگر ضمیری باطن اس امر سے آگاہ ہوتا ہے، اس بیانیہ کو کوئی ہماری جہالت کہہ سکتا ہے مگر یہ مغرب میں خود ایک تردیدی سائنس کی مابعد الجدید کوشش سمجھی جاتی ہے، مغرب کے مفکریں خدا، مصنف اور انسان سب کی اموات کا اعلان کر چکے ہیں، دراصل مغربی سائنس کو بھی اگر تصادمی پہلو سے نقادانہ دیکھا اجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی مذہب کی طرح اپنی ایک مابعد الطبیعات قایم کرتی ہے، اس کے نظریات اسکولوں اور کالجوں سے نکل عقیدہ کا روپ دھار چکے ہیں ،وہ بھی مذہب کی طرح سائنس پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتی ہے، سایئنسدانوں کے علاوہ اس کے استاد نما پیامبر بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ اس پر ، بغیر دلیل کے یقین کرنا چاہئے۔ اگر انہیں قبول کرنے اور مسترد کرنے کا اختیار نہیں دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے ہوتا ہے کہ یہ زبردستی کا نظریہ ہے جسے جدید یونیورسٹیوں نے سائنس اور سائنٹفیک ازم کو دماغ اور دماغ کے بغیر نوجوانوں کے علمی مذہب کے طور پر دعویٰ کرنے کے لیے پیش کر دیا ہے۔

تجرباتی حالات کے اندر اور باہر طبعی نظریات مشاہدے کے بیان کے مجموعوں کے درمیان ارتباط کے بارے میں دعوے کرنے کے بعد بہت کچھ کرتے ہیں، غیر نمائندہ حقیقت پسندی اس وقت تک غیر نمائندہ نہیں ہوتی ہے جب تک کہ اس میں سچائی کے خط و کتابت کا نظریہ شامل نہیں ہوتا ہے۔ حقیقت میں ایک نظریہ حریف سے بہتر کچھ مقاصد کو پورا کر سکتا ہے اور مادے کے بارے میں افراد اور گروہوں کے فیصلے غلط بھی ثابت ہو ہو سکتے ہیں۔

اے ایف۔ چامر[xl]، مشل فوکو اور فیرابند[xli] کی حالیہ تحریروں میں پڑھے جانے والے انتہائی نقطہ نظر کے مجموعی کلام کے مطابق، سائنس کی کوئی ایسی خاص خصوصیات دیگر مواقف کے مقابل علمی طور پر موجود نہیں ہیں جو اسے علم کی دیگر شاخوں جیسے قدیم افسانوں یا ووڈو سائنس سے باطنی طور پر برتر بناتی ہیں۔ سائنس کے لیے ایک اعلیٰ احترام کو جدید مذہب کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جو اسی طرح کا کردار ادا کرتا ہے جو پہلے زمانے میں یورپ میں عیسائیت نے ادا کیا تھا۔ یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ نظریات کے درمیان انتخاب انفرادی اقدار اور فرد کی خواہشات کے ذریعہ طے شدہ انتخاب پر ابلتا ہے۔ پوسٹ ماڈرن مفکرین نے سائنس کی خصوصیات، جیسے مشاہدات، تجربات، اور استقرا پر سوال کھڑے کر دئے ہیں، یہ امر یاد رکھیں کہ یہ مفکرین سرے سے ہی مذہب نواز مفکرین نہیں ہیں، بلکہ یہ لوگ مذہب سمیت ہر بڑے بیانیہ کے منکر اور ناقد ہیں، انھونے سائنس پر نقد کیا اور اس پر اس لئے سوال کھڑے کئے ہیں کیونکہ ان کے مطابق دنیا کو اس وقت جس سب سے بڑے عقیدے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ جدیدیت، سائنس اور ترقی ہیں، انھونے ڈارون ازم سے فرایڈ ازم تک کئ نظریات کو بھی خام علمی گپیں قرار دیا ہے۔

ہم سائنس اور علم کے خلاف نہیں ہیں اور نہ ہی ہم ان کو ختم کرنا چاہتے تھے. میرا نقطہ تھا۔ سائنس ایک عملی نظریہ ہے اور اس کی خوبی اور قابلیت ہے۔ لہٰذا صرف سائنس ہی سب کچھ نہیں ہے جس کی بنیاد پر کوئی یہ کہے کہ وہ دوسروں سے برتر ہے صرف اس لیے کہ وہ زیادہ سائنسی، زیادہ ترقی یافتہ ہیں، اسی لیے انہوں نے تمام تہذیبوں کو شکست دے دی ہے اور یہ تہذیب کا خاتمہ ہے۔ یہ بیانات مضحکہ خیز نوعیت کے حامل ہیں اور جس تہذیب و ترقی کی قوت کے دم پر یہ بحث جاری و ساری ہے اس کی پشت پر ایک عظیم تر سرمایہ، جامعاتی سلسلہ، ترقی کے خود ساختہ مغرب کے قایم کردہ معیارات اور مغرب کی اقوام کی منظم فوجی متحدہ قوت موجود ہے، سنگ مرمر کے فرش اونچی دیواریں، شیشہ کی کھڑکیاں، چمکتی صاف ستھری سڑکیں، آسمان میں اڑتے جہاز اور سمندر کو چیرتے پہاڑ جیسے جہاز صرف علمیت کی پیداوار نہیں ہیں، یہ سابقہ انسان کا جدید ارتقائی ترقی یافتہ فنی تعقل ہیں، یہ اس سرمایہ کی پیداوار ہیں جو مغرب نے گزشتہ چار صدیوں میں نوآبادیوں کو لوٹ کھسوٹ کر، غلام بنا کر خون بھا کر حاصل کی ہے، انسانی حقوق کا چارٹر انھونے نے بنایا ہے جنھونے دو جنگ عظیم کے دوران پچاس کروڑ لوگوں کی لاشیں گرائی ہیں، انھونے کم زور محکوم قوموں کو یا تو معدوم کر دیا ہے یا پھر ذہنی محکوم بنا کر خود کے ذیل کر دیا ہے، اور بہت سی اقوام ریڈ انڈینز اور آاسٹریلوی ابورجینز کی طرح قلت تعداد کا شکار ہوتی جاری ہیں، ۔ بہت سی علمی و منطقی بحثیں بادی النظر میں علمی و

منطقی دکھتی ہیں مگر حقیقت وجوہر میں غیر علمی اور غیر منطقی ہوتی ہیں. میرا نقد خاص طور پر مغربی سامعین پر نہیں ہے میرا نقد ان ایشیائی اور افریقیوں پر ہے جو مغرب اور سائنس کے بارے میں نہیں جانتے ہیں اور وہ جدلیانہ مباحث کے لئے تمام ضروری تقاضوں کو پورا نہیں کرتے ہیں. وہ مغرب کے بارے میں سوچتے ہیں۔ کہ ان کا کوئی مذہب نہیں ہے لیکین بھول جاتے ہیں کہ مغرب کے لئے ان کی سائنس اور جمہوری سرمایہ دارانہ تہذیب نا صرف ان کے مذہب ہیں، بلکہ ان سے مذہب کی طرح عقیدت اور اطاعت کا مطالبہ بھی کرتے ہیں ، مغربی تہذیب کی اصل یونان، روم، یہودیت اور عیسائیت پر کھڑی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، عوام کا تو یہی رویہ ہے مگر خواص میں سے ہنٹنگٹن کا وہ بیان اوپر گزر چکا ہے جس نے اس یہودیت و عیسایت کو اپنی تہذیب کی اساس مانا ہے۔

مروجہ تہذیب و ثقافت جدید قومی ریاست کے رواج کے سبب لازم و ملزوم زوجی اصطلاحیں بن چکی ہیں، تہذیب شہریت و مملکت کی وسیع شکل ہوتی ہیں تو ثقافت جب لسانی و نسلی ہوں تو مقامی ہو جاتی ہیں اور یہ اپنی انفرادیت تہذیب میں گھلا کر ضم نہیں کرتی ہیں بلکہ آئینی طور پر خود کی بقا کو تسلیم کرانے کی کوششیں کرتی ہیں، مگر جب یہ ملی اور مذہبی ہوتی ہیں تو یہ ایک وسیع رنگ وروپ میں سامنے آتی ہیں، مغرب نے ثقافتی تنوع اور سیکولرازم کے ذریعہ اسے غیر مضر و منفرد بنانے کی کوشش ضرور کی ہے، تاکہ ریاستی تہذیب کو ذیلی ثقافتوں سے تصادم نا کرنا پڑے مگر اس کے باوجود اکثریت و اقلیت کے تصادم ریاستوں کے لئے مسایل پیدا کرتے رہتے ہیں۔ مگر اس کا قطعی مطلب نہیں ہوتا ہے کہ تہذیبیں اور ثقافتیں لازمی مسلسل تصادم کی طرف مایل ہوتی ہیں، یہ مفادات، خواہشات، اور ڈھکے چھپے قوت و غلبہ کے میلانات و رجحانات ہوتے ہیں جو اس قسم کے مسایل پیدا کرتے رہتے ہیں، چناچہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہنٹنگٹن کا خوف ہی تصادم کے نظریہ کی بنیاد بنا تھا، کیونکہ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے مابین اتفاق سے زیادہ اختلاف کا پہلو زیادہ حاوی ہے، مغربی تہذیب میں خدا اور مذہب ایک منفی قوت مانے جاتے ہیں اور انسان اور جمہوری سرمایہ دارانہ حریتی اقدار مثبت روپ میں بیان کئے جاتے ہیں، جبکہ اسلام میں خدا اور شریعت مثبت بنیادی اقدار کی علامت ہیں اور انسان ایک مفعول مجھول مخلوق یا عبد مانا جاتا ہے جو بنا خدا اور بنا مذہب کے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ لہذا دونوں اقدار کا تصادم نظریاتی پیچیدگیوں کو جنم دینے کا سبب بنتا ہے۔

Reference

[i] Samuel P. Huntington. The Clash of Civilizations?.newyork.Foriegn Affairs.Summer.1993.vol:72.No:3.

[ii] The End Of A Times(or days).

[iii] The clash of Civilizations.

[iv] Edward Said.The Myth Of The Clash Of The Civilization. Media Education Foundation :1998:pp:4. https://www.thenation.com/article/archive/clash-ignorance/

[v] فوکویاما۔تاریخ کا خاتمہ۔ کراچی۔ سٹی بک پوائنٹ:۲۰۰۳:صہ:۳۔

[vi] The case Of Islam.

[vii] فوکویاما۔تاریخ کا خاتمہ۔ کراچی۔ سٹی بک پوائنٹ:۲۰۰۳:صہ:۷۔

[viii] The Clash of Ignorance۔

[ix] EDWARD W. SAID۔The Clash of Ignorance۔Online. The Nation.4.oct.2001. ..Edward Said. The Myth Of The Clash Of The Civilization. Media Education Foundation :1998:pp:4. https://www.thenation.com/article/archive/clash-ignorance/

[x] Dr. Mathieu Guidère &Newton Howard.The Clash of Perceptions.newyork. The Center for Advanced Defense Studies.Directorate Of research.nov.2006.pp:3.

[xi] Samuel P. Huntington. The Clash of Civilizations?.newyork.Foriegn Affairs.Summer.1993.vol:72.No:3.pp:25.

[xii] CulTure + CivilizatioN:C2(تث۔)

[xiii] Chambers Essential Dictionary.Edinburgh.Chambers Harrap Publishers.1998.pp:166.

[xiv] Collier's Dictionary.NY.Mac Millian Educational Company.1986.vol:1:A-k.pp:182.

[xv] Samuel P. Huntington. The Clash of Civilizations?.newyork.Foriegn Affairs.Summer.1993.vol:72.No:3۔

[xvi] Chambers Essential Dictionary.Edinburgh.Chambers Harrap Publishers.1998.pp:219.

[xvii] Collier's Dictionary.NY.Mac Millian Educational Company.1986.vol:1:A-k.pp:245.

[xviii] Kreitner and kinicki

[xxxiii] Collier's Dictionary.NY.Mac Millian Educational Company.1986.vol:1:A-k.pp:319.

[xxxiv] M. Judd Harmon. Political Thought: from Plato to the Present.isb.National book foundation.1998.pp:346,347.

[xxxv] Will Durant.Thepleasure Of Philosophy.NY. Simon & Schuster.Reproduced by services book club.rwd.1981.pp:3.

[xxxvi] David Robertson.Dictionary Of politics.middlesex.penguin books.1990.pp:94.

[xxxvii] Immanuel Kant.What is Enlightenment?.Encyclopedia Encarta.2009.DvD Edition.Keyword:Kant.

[xxxviii] Larouse Encyclopedia Of Modern History:1500 to present Day.middlese.Hmlyn Publishing Group.1974.pp:187.

[xxxix] Dr. Mathieu Guidère &Newton Howard.The Clash of Perceptions.newyork. The Center for Advanced Defense Studies.Directorate Of research.nov.2006.pp:17,18.

[xl] A.F.Chalmers.What is called science?USA.Open UniVersity Press.1988.162..172.

[xli] Pual Feyeraband.Against Method:An outline of an Anarchisti Theory of Knowledge.london.New left.1975.pp:

[xix] Edgar Sachin.

[xx] Robert kreitner and Kinicki.Organizational behavior.NY(USA).MC-Graw Hill.2001.pp:105,106.

[xxi] Robert kreitner and Kinicki.Organizational behavior.NY(USA).MC-Graw Hill.2001.pp:37,125.

[xxii] Peter Walensteen. Under Standing Conflict Resolution.london.Sage Publication .ltd.2007.pp:166.

[xxiii] Samuel P. Huntington. The Clash of Civilizations?.newyork.Foriegn Affairs.Summer.1993.vol:72.No:3.

[xxiv] George Nirmala."Indian Intellecruals alarmed by rising Intolerance Attacks".khi.Daily Dawn:1.11.2015

[xxv] I.H.Qureshi(ed).The Short History Of Pakistan.Karachi.Karachi University press.1998.vol:4:pp:218.

[xxvi] I.H.Qureshi(ed).The Short History Of Pakistan.Karachi.Karachi University press.1998.vol:4:pp: 218.

[xxvii] Samuel P. Huntington. The Clash of Civilizations?.newyork.Foriegn Affairs.Summer.1993.vol:72.No:3_pp:27.

[xxviii] Samuel P. Huntington. The Clash of Civilizations?.newyork.Foriegn Affairs.Summer.1993.vol:72.No:3_pp:39.

[xxix] Dr. Mathieu Guidère &Newton Howard.The Clash of Perceptions.newyork. The Center for Advanced Defense Studies.Directorate Of research.nov.2006.pp:2.

[xxx] Chambers Essential Dictionary.Edinburgh.Chambers Harrap Publishers.1998.pp:194.

[xxxi] religáre_

[xxxii] Hutchinson's Twentieth Century Encyclopedia.london.Hitchinson co.ltd.1961.pp:533.